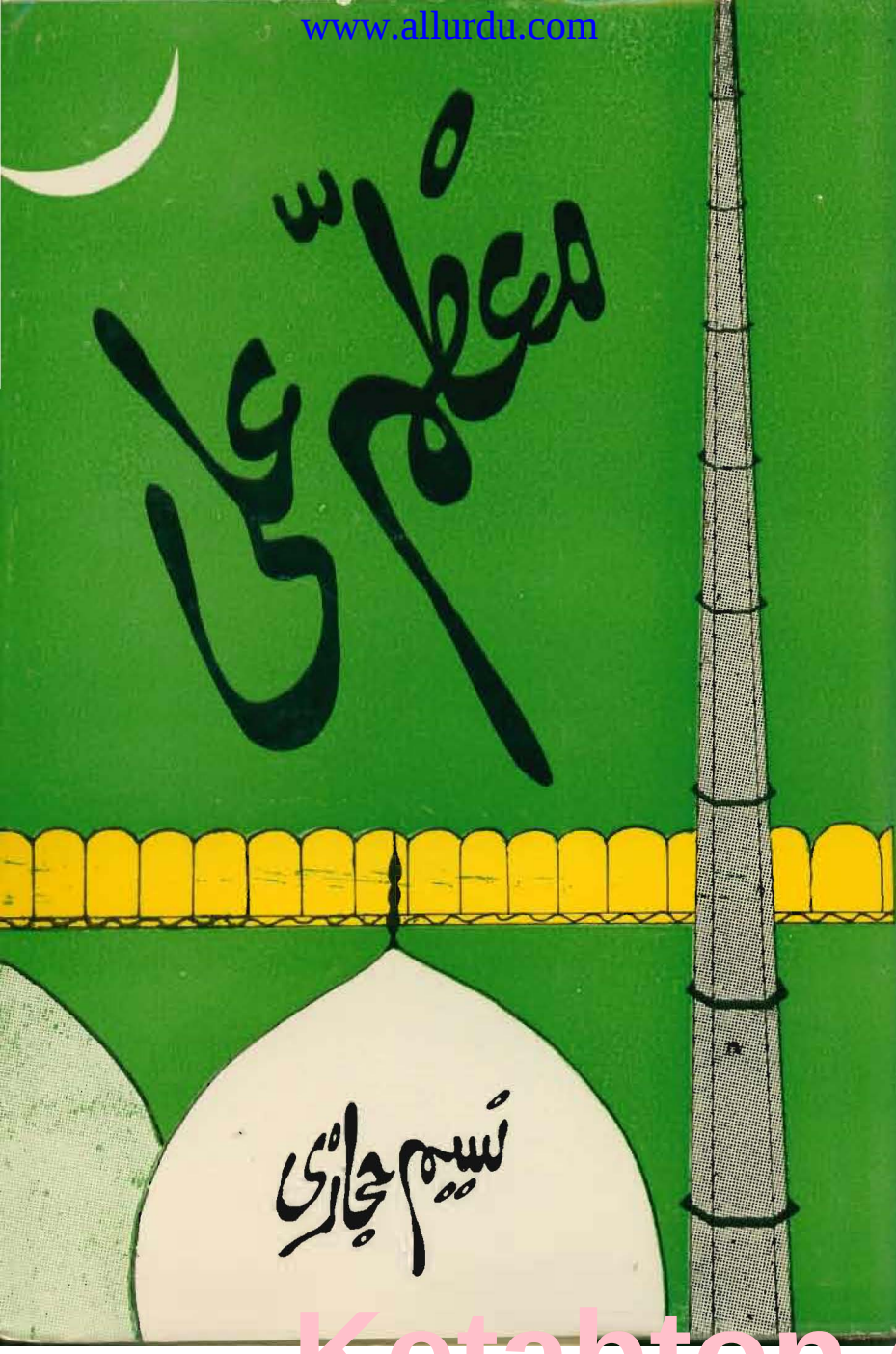




Ketabton.com

www.allurdu.com

مُعَظَّم عَلٰی

نَسِیمِ حِجَازِی

☆

فرحین پبلشنگ کمپنی F3 کھجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

www.allurdu.com

پہلا باب

معظم علی مرشد آباد کے قید خانے کی ایک کوٹھری میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاٹی کی ہستان
اُن اُمیدوں، آرزوؤں، حوصلوں اور دلولوں کی داستان تھی جو پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ
کی شکست کے ساتھ دم توڑ چکے تھے۔ زندگی کے دامن میں اب اُس کے لیے ہسب و تارکیوں
کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ پہلے بھی مرشد آباد سے کوسوں دور ایک قید خانے میں رہ چکا تھا۔ لیکن دلوں اپنی تاریک
کوٹھری میں وہ اس مرشد آباد کا تصور کر سکتا تھا جس کا ہر گوشہ قوس قزح کی انگلیوں سے بریز
تھا۔ حال کی تنہا اُسے مستقبل کی مستروق کا پیغام دے سکتی تھیں۔ اسیری کی رات کے تاریک
پرفے اٹھا کر وہ صبح آزادی کے آفتاب کی سنہری کرنیں دیکھ سکتا تھا۔ اڑلیسہ کی سرحد کے
پارہ قید خانہ اہل کے راستے کی ایک منزل تھی اور اسے یقین تھا کہ کسی دن وہ اس منزل سے گزر
کر وہ پھر اس دنیا میں پہنچ جائے گا، جہاں زندگی کی مسکراہٹیں اس کے استقبال کے لیے
موجود ہیں۔ لیکن مرشد آباد میں اس کی اسیری کا زمانہ ان ستاروں کی جھللاہٹ سے محروم تھا
جو تاریک رات کے مسافروں کو صبح کا پیغام دیتے ہیں۔

کوٹھری کی دیوار میں چھت کے قریب ایک تھوڑا سا روزن تھا اور قید کے ابتدائی ایام
میں اس روزن سے سورج کی شعاعیں اسے دنیا کا پیغام دیا کرتی تھیں جہاں ابھی تک اُمید
کا ایک چراغ نہیں رہا تھا۔ وہ تصور میں اپنے ماحول کی بھیاں تک تاریکیوں سے نکل کر اس مکان

نام کتاب _____ معظم علی

مصنف _____ نسیم ججاری

ناشر _____ فرحین پبلشنگ کمپنی

۴۳ بھجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

تعداد _____ ایک ہزار

مطبع _____ فرح انسٹیٹ پرنٹرس دہلی

سال اشاعت _____ فروری ۱۹۹۶ء

قیمت _____ ساٹھ روپے / 60/- Rs.

فرحین پبلشنگ کمپنی ۴۳ بھجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نید

سول ایجنٹ

ادبی دنیا ۵۱۰ مٹیا محل دہلی ۱۱۰۰۰۶

کی چار دیواری میں جا پہنچتا جو اس کی سوچوں میں امیدوں کی آخری جلتے پناہ تھا۔ وہ اُن کمرلوں کا طواف کرتا جہاں کبھی مسرت کے قہقہے گونجتے تھے۔ اچانک فرحت مکان کے کسی گوشے سے نمودار ہوتی اور وہ کہتا "فرحت! فرحت! میں آگیا ہوں۔ میں زندہ ہوں، میں تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ قید خانے کی تنہائیوں میں تم ہر وقت میرے ساتھ تھیں۔ میرے پسینے اور آرزوؤں سب تمہارے لیے تھیں۔ مجھے ڈرتا کہ تم کہیں جا چکی ہو اور میں تمام عمر تمیں تلاش کرتا رہوں گا۔ کاش قید خانے میں مجھے تمہارا کوئی پیغام مل سکتا۔ فرحت! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم مرشد آباد سے کہیں دور نکل جائیں گے اور اپنے لیے ایک نئی دنیا آباد کریں گے۔ تمہارے ساتھ رہ کر میں کبھی یہ محسوس نہیں کروں گا کہ میں کاروانِ حیات کا ایک لٹا ہوا مسافر ہوں۔"

پھر اس کی کوٹھڑی میں اور قیدی آئے اور انہوں نے بتایا کہ فرحت اور اس کے والدین تمہاری گرفتاری کے اگلے دن مرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے۔

اس کے بعد مظہر علی کو مستقبل کے متعلق سوچوں میں امیدیں زیادہ کرب انگیز محسوس ہوتی تھیں۔ وہ فرحت کو ان دیکھے صحراؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں تلاش کیا کرتا تھا۔ کبھی وہ اسے کسی دور افتادہ بستی کی چھوٹی سی دیوکتا اور کبھی وہ اسے کسی پر رونق شہر کے محل میں نظر آتی تھی۔ پھر اُس شبابِ نقب کی طرح جو ایک تانبہ کے لیے تاریک فضا میں ڈرکے خزانے کی بکھیرنے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے۔ فرحت کی دلکش تصویریں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں اور وہ حال اور مستقبل کے بیابانِ غلامی سے نکل کر ماضی کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتا۔ کبھی تصور اسے اس مکان میں لے جاتا جہاں اس نے زندگی کی ابتدائی مسکرائیں دیکھی تھیں۔ کبھی وہ اس محلے کی گلیوں میں گھومتا جہاں وہ اپنے بچپن کے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ سنِ شعور سے لے کر قید خانے میں پہنچنے تک کی زندگی اسے ایک خواب معلوم ہوتی تھی۔ ایک ایسا خواب جو دکھ بھی تھا اور بھیانک بھی :-

مظہر علی اُس دم کا فرد تھا جو صدیوں تک اس ملک میں اپنی سلطنت و اقبال کے چیمپ لہنے کے بعد زوال کے آخری مرحلوں میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اس وقت آنکھ کھولی تھی جب مغلوں کی عظیم الشان سلطنت لامرکزیت اور انتشار کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد چند سال کے اندر اندر ہندوستان کا وہ دفاعی حصار پر بند زمین ہو چکا تھا جسے تیمور کے جانشینوں نے تعمیر کیا تھا۔ دلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے چاروں قسمت آزمائوں کے لشکر موجود تھے۔ ملک کی سیاست ہر ضابطہ اخلاق سے آزاد تھی۔ نامِ نادر بادشاہ اپنے وزیروں، اہلکاروں اور بعض اوقات خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں شطرنج کے مہرے تھے۔ طالع آزمائوں کی تلواریں کبھی تاج پہننے والوں کے سر قلم کرتی تھیں اور کبھی تاج پہنانے والوں کے خون میں نہاتی تھیں۔ اقتدار کی مسند تک پہنچنے کے لیے ایک قسمت آزمائی لاش دوسرے قسمت آزمائے کے لیے زینے کا کام دیتی تھی، عمدہ لکھنی، عیاری، فریب، سازش اور قتل۔ لال قلعے کی دیواریوں میں جنم لینے والی داستانوں کے مستقل عنوان بن چکے تھے۔ لال قلعے سے باہر ہر صوبیدار اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے کی فکر میں تھا۔

مرکز اور صوبوں میں علاقائی سیاست کا یہ دور المٹاک بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ بادشاہ سلطنت کبھی کسی امیر کی تلوار سے مرعوب ہو کر اور کبھی اس کی خوشامد سے خوش ہو کر اسے کسی علاقے کی صوبیداری کی سند عطا فرماتے۔ وہ صوبائی دارالحکومت کی طرف روانہ ہوتا تو اسے راستے میں یہ خبر ملتی کہ شہنشاہ والا تبار نے اپنا پہلا حکم نامہ منسوخ فرما کر کسی اور کو صوبیداری کی سند عطا کر دی ہے اور وہ بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت صوبائی دارالحکومت کا رخ کر رہا ہے۔

پھر صوبے کے امراء کا ایک گروہ پہلے امیدوار کے ساتھ اور ایک دوسرا گروہ دوسرے امیدوار کے ساتھ مل جاتا۔ دونوں میں جگمگ ہوتی۔ ہانے والا امیدوار اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور اس کا خون جھپٹنے والے کی سند پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ صوبیدار کا ایک امیدوار شاہی زمان کے عوض ایک محول رقم پیش کرتا اور دوسرا امیدوار اس سے زیادہ

رقم دے کر اپنے لیے ایک اور فرمان حاصل کر لیتا۔

۱۷۵۰ء میں سلطنتِ دہلی کے ایک ہوشیار وزیر نظام الملک آصف جاہ نے اپنی فطرتِ چالوں کی بدولت دکن میں مضبوطی سے قدم جما لیے۔ وہ بظاہر دلی کے نام نہاد بادشاہ کا صوبیدار تھا لیکن عملاً دکن کے سیاہ و سفید کا مالک بن چکا تھا۔ یہی نظام الملک کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے۔

نظام الملک آصف جاہ اول کے اسلاف، سلطنتِ خوارزم پر تاتاریوں کے حملوں کے زمانہ میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ اسی طرح ایک اور خاندان ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں اسی خاندان کا ایک فرد محمد جان جہاں انور الدین حکومت کا ادنیٰ ملازم تھا۔ لیکن اورنگ زیب کی موت کے بعد جب ہر قسمت آزما کے لیے قری کے راستے کھلے تھے۔ یہی جان جہاں، خان جہاں بن گیا اور کرناٹک کی نظمیت پر فائز ہوا۔ ۱۷۵۳ء میں انور الدین خان جہاں نے وفات پائی اور کرناٹک کی حکومت اُس کے بیٹے محمد علی والا جاہ کے ہاتھ میں آئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال اور جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر فرنگی تاجروں کی بستیوں نے خلا میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ ایک طویل کشمکش کے بعد انگریز اور فرانسیسی تاجر اپنے پر لگائی اور دلنیزی و بغض کو مات دے چکے تھے اور اب وہ ہندوستان کی تجارتی منڈیاں تلاش کرنے کی بجائے اس ملک کے سیاسی اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ انھوں نے ملک کے اندرونی فتنہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جب کسی صوبہ میں حکومت کے دو دعوے داروں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو ایک فریق انگریزوں کی حمایت حاصل کرتا اور دوسرا فریق اپنا مستقبل فرانسیسیوں کے ساتھ وابستہ کر دیتا۔

دکن میں نظام الملک آصف جاہ اول کے جانشین کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسیوں کے ہاتھ میں کھیلے رہے۔ کرناٹک میں محمد علی والا جاہ انگریزوں کی بساط سیاست کا ایک مہرہ تھا

اور فرانسیسی کرناٹک کی حکومت کے ایک اور دعوے دار چندا صاحب کے طرفدار بن گئے تھے۔ چندا صاحب نے کرناٹک کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر کے محمد علی کو ترجیح ملی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ چند سال تک محمد علی ایک ایسا مکران تھا جس کے قبضے میں کوئی ملک نہ تھا اور جس کی رعایا زیادہ تر اپنے خاندان کے افراد، چند نوکروں، جی حندیوں اور خوشامیل حکم محدود تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ انگریزوں کی سنگینوں کے پہرے میں باقاعدہ دربار لگاتا تھا۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے تھے اور اسے نواب والا جاہ، امیر السند، عمدة الملک، آصف الدولہ محمد علی خاں، بہادر ظفر جگ، پیر سالار، صاحب السیف و القلم، تدبر امرائے عالم، فرزند عزیزان جہاں کے انتساب و خطابات سے پکارا جاتا تھا۔ جب انگریز، فرانسیسیوں سے کرناٹک کا کوئی علاقہ فتح کرنے کی توجہ پیر سالار اپنی حرم سرا میں جشن مناتا اور جب انھیں اپنی افواج کو تہوار دینے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی تو اس تدبیر امر عالم کو منگوا لیا۔ احوال عوام سے ٹیکس وصول کرنے کے کام پر لگا دیا جاتا۔

پہلے چندا صاحب نے فرانسیسیوں کی خدمات کے صلے میں کرناٹک کے بعض علاقے ان کے حوالے کر دیئے۔ پھر جب محمد علی کی باری آئی تو اس نے انگریزوں کو عملاً کرناٹک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ بظاہر کرناٹک محمد علی کی شکار گاہ تھا لیکن شکار کھیلنے والے انگریز تھے۔

دلی کے تخت کے ساتھ زبانِ اودھ کا تعلق بھی برائے نام تھا۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکومت پر ملی وردی خاں نے قبضہ جمایا۔ اس زمانے میں جنوبی ہند کی طرح بنگال میں بھی انگریز تاجر اپنے قدم جما چکے تھے۔ لیکن ملی وردی خاں ایک بیلہ مخروا اور دراز پیش مکران تھا۔ اور اس نے فرنگی تاجروں کو جو مراعات دیں ان کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ وہ اپنی تجارتی بستیوں میں قلعہ یا دفاعی چوکیاں تعمیر نہیں کریں گے۔

اس زمانے میں ہندوستان کی ایک اور بڑی طاقت مرہٹے تھے جو مغلیہ سلطنت کے کٹھنوں پر اپنی سلطنت کی بنیادیں استوار کرنے کی فحشیں تھے۔

زیادہ گھل گئے تو آصف اور افضل اصرار کر کے معظم اور اس کے بھائی کو اپنی جگہ پر بٹھالیے۔ گھر پر حسین بیگ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک معقول تنخواہ پانے والا تالیق مقرر تھا اور معظم اور یوسف کا باپ فرصت کے اوقات میں خود ہی انھیں پڑھا دیا کرتا تھا۔

امراء کے بچوں کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی ضروری خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ جب آصف اور افضل ذرا بڑے ہوئے تو حسین بیگ نے ان کی فوجی تربیت کے لیے ایک تجربہ کار فوجی اشرفی خدمات حاصل کر لیں۔ وہ انھیں شہنشاہی، تیراندازی اور نیزہ بازی سکھایا کرتا تھا۔ لیکن عمود علی نے اس کام کے لیے کسی اور کی خدمات کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مرشد آباد میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو گھوڑے کی سواری اور توار، نیزہ اور بندوق کے کھیلوں میں اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

اس کے گھر میں ایرانی قالین نہ تھے لیکن اس کے اصطل میں عربی نسل کے تین چار گھوڑے ضرور موجود رہتے تھے۔ سونے چاندی کے برتنوں کی بجائے وہ اپنے ذاتی اسلحہ خانے کی بہترین تواروں اور بندوقوں پر فخر کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی مصروف زندگی سے بچوں کے لیے تھوڑا بہت وقت نکالتا اور انھیں گھوڑوں پر سوار کر کے شہر سے باہر کسی کھلے میدان میں لے جاتا۔

مرزا حسین بیگ کے کتب خانہ میں سینکڑوں کتابیں تھیں اور یہ کتابیں اس نے پڑھنے کا شوق پورا کرنے سے زیادہ اپنے دوستوں کو دکھانے کے لیے جمع کر رکھی تھیں۔ معظم کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ کبھی کبھی افضل بیگ سے کتابیں مانگ لایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اس کے گھر گیا تو افضل اور آصف دیوان خانے کے باہر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے اپنے عمر رسیدہ تالیق سے سبق لے رہے تھے۔ ان کی توجہ کتابوں کی طرف تھی۔ معظم علی کچھ دیر تذبذب کی حالت میں چند قدم دور کھڑا ہوا۔ اچانک آتالیق نے اس کی طرف دیکھا اور کہا: "بھئی تم کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ کھیلنے کا وقت نہیں یہ پڑھ رہے ہیں۔ بھاگ جاؤ!"

معظم علی نے اس وقت آنکھ کھولی تھی جب ہندوستان مرہٹہ لیڈوں کے لیے ایک وسیع لشکر گاہ بن چکا تھا۔ اس کا باپ عمود علی، علی وردی خان کی محافظ فوج میں پانچ سو سواروں کا سالار تھا۔ مرشد آباد کے شہر سے باہر ایک نئے محلے میں عمود علی کے مکان کے سامنے ایک بہت بڑے جاگیردار مرزا حسین بیگ کا قلعہ نمائل تھا۔ جس کی چار دیواری کے اندر رہائشی مکان کے علاوہ گھوڑوں کے اصطل اور نوکروں اور پھرے داروں کے کمرے تھے۔ معظم علی کا باپ ایک فوجی افسر ہونے کے باوجود مرزا حسین بیگ کے مقابلے میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ ابتداء میں ان کے تعلقات محض رسمی تھے۔ لیکن ان کے بیٹوں کی دوستی آہستہ آہستہ انھیں بھی ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ حسین بیگ کا چھوٹا بیٹا افضل بیگ، معظم علی سے دو سال بڑا تھا۔ اور بڑا جس کا نام آصف بیگ تھا، معظم علی کے بڑے بھائی یوسف علی کا ہم عمر تھا۔ بچپن میں یوسف اور معظم محلے کے دوسرے بچوں کی طرح حویلی میں چلے جاتے اور دن بھر آصف بیگ اور افضل کے ساتھ کھیلتے رہتے۔

حویلی میں ایک سُنہری بابوں والی کم سن لڑکی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، اور معظم علی کو اس کے معصوم قہقہے بہت پسند تھے۔ یہ لڑکی افضل کی چھوٹی بہن تھی اور اس کا نام فرحت تھا۔

عمود علی اور اس کی بیوی کو حسین بیگ کے خاندان کے مقابلے میں اپنی کمزری کا احساس قلعہ تاہم انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے بچے کسی کے مقابلے میں حقیر سمجھے جائیں۔ چنانچہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ ان کے بچوں کا لباس اگر حسین بیگ کے بچوں کی طرح قیمتی نہ ہو تو کم از کم صاف ستھرا ضرور ہو۔ پھر جب آصف اور افضل مرشد آباد کے بہترین مکتب میں داخل ہوئے تو عمود علی نے یوسف اور معظم کو بھی اسی مکتب میں داخل کر دیا۔ ذوق صرف اتنا تھا کہ افضل اور آصف بھی پر سوار ہو کر جلتے تھے اور یوسف اور معظم کو پیرل جانا پڑتا تھا۔ پھر جب یہ بچے آہل بہت

یہ بات معظم علی کے لیے غیر متوقع تھی اور وہ چند گنیے یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔
افضل بیگ نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے آتائین سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ کتابیں لینے آیا ہے
مجھے اجازت دیجئے میں ابھی آتا ہوں۔"

آتائین جس قدر کھینے والے لڑکوں کو ناپسند کرتا تھا اسی قدر اسے پڑھنے والوں سے دلچسپی
تھی۔ اُس نے دوبارہ معظم علی کی طرف دیکھا اور افضل سے کہا: "اچھا جاؤ لیکن جلدی آنا!"
افضل بیگ اٹھ کر معظم علی کے ساتھ چل دیا۔ دیوان خانے کے چند مردل کے طویل
برآمدے سے گزرنے کے بعد وہ کونے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جس کا ایک
دروازہ رہائشی مکان کے صحن کی طرف کھلتا تھا۔ کمرے میں ساگوان کی خوبصورت الماریاں
کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ افضل بیگ نے کہا: "تم اطمینان سے اپنے لیے کتابیں نکالو
میں استاد کے پاس جاتا ہوں۔"

افضل بیگ بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ معظم علی اس کمرے میں کئی بار پہلے بھی آچکا
تھا۔ اسے اپنے مطلب کی کتابیں نکالنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دو
عربی اور تین فارسی کی کتابیں لے کر باہر چل دیا۔ واپسی پر وہ افضل اور آصف کے قریب سے
گزر کر آتائین نے اسے دیکھتے ہی آواز دی: "میاں صاحبزادے ذرا ادھر آؤ!" معظم بھجکتا ہوا
معرسیدہ آتائین کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ آتائین نے کہا: "دکھاؤ کون سی کتابیں پڑھتے ہو تم؟"
معلم نے کتابیں آگے بڑھادیں۔ آتائین نے یکے بعد دیگرے تمام کتابیں کھول کر دیکھیں اور
قدرے حیران ہو کر کہا: "تم یہ کتابیں پڑھ سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"میرا مطلب ہے کہ تم انہیں سمجھ بھی سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اچھا تم تمہارا امتحان لیتے ہیں؟ یہ کہہ کر آتائین نے عربی کی ایک کتاب اٹھا کر کھولی اور

معلم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اچھا یہ پڑھ کر سناؤ!"

معلم نے اطمینان سے چند سطریں پڑھ کر سنا دیں تو آتائین نے ترجمہ کرنے کے لیے کہا: "معلم
نے کسی جھجک کے بغیر ترجمہ سنا دیا تو آتائین نے سوال کیا: "تم کھل تعلیم پاتے ہو؟"
"جی میں افضل کے ساتھ پڑھتا ہوں۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"جی اسی محلہ میں اس مکان کے بالکل سامنے۔"

"تم۔۔۔۔۔ تم محمود علی خان کے بیٹے ہو؟"

"جی ہاں۔"

آتائین کچھ کنا چاہتا تھا کہ چچے سے کسی کی آواز سنائی دی: "یہ کون ہے؟"

"آتائین نے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹھکا کر ہو گیا۔"

"آپ تشریف رکھیے؟ مرزا حسین بیگ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا: "اور یہ شاہ محمد علی کا

لڑکا ہے۔"

"جی ہاں میں ابھی اس سے متعارف ہوا ہوں بہت ہنسنا رہا ہے۔ دیکھیے یہ آپ

کے کتب خانہ سے صبح فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یہ کتابیں اس عمر کے بچوں کے لیے بہت مشکل ہیں۔

اگر آپ اجازت دیں تو میں صاحبزادوں کے ساتھ اسے بھی پڑھادیا کروں؟"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے عزیز لڑکے محنتی ہوتے ہیں اور بچے امید ہے کہ آصف لڑکے

افضل کے لیے ایسے لڑکے کی رفاقت اچھی رہے گی۔ یہ کہہ کر حسین بیگ معظم علی کی طرف متوجہ

ہوا: "برخوردار تم محبت سے چھٹی کے بعد میاں آجایا کرو۔ میں محمود علی سے بھی کہہ دوں گا۔"

"جی بہت اچھا۔" معظم علی نے تشکر کے ساتھ نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

آصف نے کہا: "آبا جان معظم کا بڑا بھائی یوسف علی میرا ہم جماعت ہے اگر آپ کی اجازت

ہو تو وہ بھی میاں آجایا کرے۔"

میں گھوڑا بھگاتے اور نشانہ بازی کرتے دیکھا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ نوکروں اور پرہیزگاروں کی کوٹھڑیوں کے قریب چم کر کے باہر کی فصیل کے قریب ایک درخت کے نیچے چند سپاہی جمع تھے۔ اور ایک میز پر چار پستول رکھے ہوئے تھے۔ سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی شاخ کے ساتھ ایک تختی لگ رہی تھی جس کے درمیان پان کی شکل کا ایک سرخ نشان بنا ہوا تھا۔ سپاہی حسین بیگ کو دیکھ کر ادب سے ادھر ادھر مٹ گئے اور شیر علی کے اشارے پر آصف نے پستول چلا دیا۔ نشانہ سرخ نشان کے پچھلے کنارے پر لگا اس کے بعد افضل کا باری آئی اور اس کی گولی سرخ نشان سے کوئی دو اینچ باہر لگی۔ تاہم اس کی عمر کے لحاظ سے یہ بھی ایک کارنامہ تھا اور پورھا استاد مرزا حسین بیگ کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”اچھا اب دوبارہ گوشش کرو! اس نے کہا۔

بچوں نے خالی پستول میز پر رکھ دیئے اور بھرے ہوئے پستول اٹھالیے۔ افضل کی دھڑکی گونش قریب سے بہتر تھا لیکن آصف کا ہاتھ بل گیا اور اس کی گولی تختی کو چھوئے بغیر نکل گئی۔ دو سپاہی میز کے قریب کھڑے پستول بھرنے میں مصروف تھے۔ آصف نے اپنی کھسیا ہٹ چیلنے کے لیے جلدی سے خالی پستول میز پر رکھا اور بھرا ہوا پستول اٹھا لیا اب اس کی گولی نشانہ پر لگی۔ افضل کی باری آئی تو وہ بھرا ہوا پستول اٹھا کر خود نشانہ لگانے کی بجائے معظم علی کی طرف بڑھا اور بولا: اب تمہاری باری ہے۔

معظم نے قریب سے توقف کے بعد اپنی کتاب میں ایک سپاہی کے ہاتھ میں دے دیں اور افضل کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔

حسین بیگ نے کہا: میاں صاحب زادے دیکھنا کسی آدمی کو زخمی نہ کر دینا!

افضل نے کہا: جی آپ فکر نہ کریں اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔

معظم آگے بڑھا۔ اس نے نشانہ کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور

حسین بیگ نے جواب دیا: اگر تمہارے استاد کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔

اتاق نے کہا: جی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

اندرونی چار دیواری کے پھانک سے ایک نوکر نمودار ہوا اور اس نے حسین بیگ کو سلام کرنے کے بعد اتاق کی طرف متوجہ ہو کر کہا: جناب شیر علی خاں صاحب پوچھتے ہیں کہ صاحبزادہ کب فارغ ہوں گے؟

اتاق نے جواب دیا: بس میں آج کام ختم کر چکا ہوں یہ جا سکتے ہیں۔

آصف اور افضل اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

افضل نے کہا: معظم آؤ تم بھی، ہم آج کل پستول چلانے کی مشق کر رہے ہیں۔ معظم علی

بھگتا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ چل دیا۔

حسین بیگ نے اتاق سے کہا: چلیے آج آپ بھی اپنے شاگردوں کا نشانہ دیکھیے۔

اتاق کا نام بابا القدر تھا اور اس کا شمار مرشد آباد کے چند چیدیہ علماء میں ہوتا تھا وہ حسین بیگ کے ساتھ باتیں کرتا ہوا علی کی اندرونی چار دیواری سے نکل کر بیرونی احاطے میں داخل ہوا تو وہاں پھانک سے چند قدم دور دیوار کے ساتھ ایک برآمدے میں بچوں کا فوجی استاد دیکھا دیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی آگے بڑھا۔ حسین بیگ نے کہا: ہم آپ کے شاگردوں کا نشانہ دیکھنے آئے ہیں۔ شیر علی نے کہا: یہ میری خوش قسمتی ہے اور مجھے امید ہے کہ میرے شاگرد آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ چلیے!

حسین بیگ نے کہا: شیر علی! یہ معمولی کا بیٹا ہے۔ مولوی صاحب نے آج زبردستی اسے اپنا شاگرد بنالیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس کا امتحان لیں۔

شیر علی نے جواب دیا: جناب اس کا امتحان لینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے باہر لیا

طرف بار بار محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی لیکن فرحت نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ ایک بار اس کی ماں نے کہا: فرحت! بیٹی تم نے اپنی خالہ کو سلام نہیں کیا اور فرحت نے بے توجہی سے آمنہ کی طرف دیکھا اور تنگدلی سے سلام کہہ کر ایک خوش پوش امیر زادی کے ساتھ بائیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔ تاہم آمنہ کے دل سے اس کے لیے ہزاردوں دعائیں نکل رہی تھیں لیکن کاش یہ شورش اور جینوں کی جیسے آمنہ نے اپنی نظر میں اپنی بیٹی چھو لیا تھا اسکی دعاؤں سن سکتی۔ کاش وہ اپنے بچے جیسے کی دوسری خواتین کی طرح اسے اپنے پاس بٹھا سکتی اس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر سکتی۔ اس کے سنہری بالوں کو اپنے ہاتھوں سے سنوار سکتی وہ دوسری دور سے اُن شورش آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی میں ہمالیہ کے وادی کی بھیلوں کی دکھائی اور گرائی نظر نظر آتی تھی وہ اس کے خوبصورت دانت دیکھ رہی تھی جو ہنستے وقت موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ دعوت کے اختتام پر وہ اپنے دل میں یہ احساس لے کر نکلی کہ حسین بیگ کی بیوی اور اس کے درمیان محبت کی دیوار بدستور کھڑی ہے۔

لیکن یہ دیوار زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ یوسف اور معتمد کے ساتھ افضل اور اصفت کی بے تکلفی بڑھتی گئی۔ پہلے جب وہ مدرسے جانے کے لیے گھسی پر سول ہو کر گھر سے نکلتے تھے تو معتمد اور یوسف ڈیوڑھی کے سامنے ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے۔ اب اگر انھیں کبھی دیر ہو جاتی تو اصفت اور افضل اپنی گھسی ان کے دروازے کے سامنے کھڑی کر کے انھیں بلا لیتے۔ گھر میں اپنے والدین کے ساتھ ان کی باتیں ایک دوسرے کے متعلق ہوتیں۔ ہم آج فلاں جگہ سیر کے لیے گئے تھے۔ آج ہماری فلاں محلے کے لوگوں کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی۔ ہم صرف چار تھے اور ہم نے اتنے لوگوں کو مار بھجایا تھا۔ آج پیر کی میں ہمارا مقابلہ ہوا تھا اور فلاں سب سے آگے نکل گیا تھا۔ آج فلاں نشانہ بازی اور فلاں نیزہ بازی میں اڈل آیا تھا۔ حسین بیگ کے گھر میں افضل میرٹھ معتمد علی کی اور اصفت ہمیشہ یوسف کی کسی نہ کسی خوبی کی تعریف کرتا۔ اسی طرح جب سب عظم اور یوسف سونے سے پہلے اپنے والدین کو دلوں بھر کے واثقات سناتے تو معتمد کی زبان پر بار بار افضل کا نام آتا اور یوسف کی زیادہ باتیں عام طور پر اصفت کے متعلق ہوتیں پھر پانچ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب آمنہ دوسری بار حسین بیگ کے ہاں گئی تو افضل کی ماں کے ساتھ تنہائی بے تکلفی سے پیش آئی۔

آگھ بیگم کی دیر میں لمبی دبا دی۔ دیکھنے والے سرخ نشان کے مین وسط میں ایک سوراخ دیکھ رہے تھے۔

معتمد علی نے خالی ہستول میز پر رکھ دیا اور سپاہی کے ہاتھ سے کتابیں لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ حسین بیگ نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا: شاباش! تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے!

جی میرے بھائی کا نشانہ مجھ سے بہتر ہے!

حسین بیگ نے میز سے ایک ہستول اٹھایا اور معتمد علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہہ تم انعام کے حقدار ہو۔ یہ لوادر دیکھو۔ جب تم بڑے ہو کر جنگ کے میدان سے سرخرو ہو کر آؤ گے تو میں تمہیں اپنے اسلحہ خانے کی بہترین بندوق اور اپنے ہستول کے بہترین گھوڑے کا حقدار سمجھوں گا۔



اس واقعہ کے تین دن بعد حسین بیگ کے ہاں مرشد آباد کے چند امرار کی دعوت تھی اور محمود علی کو پہلی بار اس کے دسترخوان پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا ایک ہفتہ بعد حسین بیگ کی بیوی نے شہر کی چند معزز خواتین کو دعوت دی اور اس نے معتمد علی کی ماں آمنہ کو بھی مدعو کیا۔ حسین بیگ کی بیوی بظاہر آمنہ کے ساتھ تپاک سے پیش آئی لیکن اپنے جیسے جیسے اکثر خواتین نے اس کے ساتھ بے تکلف ہونا پسند کیا اور اپنی میزبان کے ظاہری غلوں کے باوجود آمنہ پر بات غموں کیے بغیر نہ سکی کہ سن بچوں کی دوستی اور ان کے دعوتیں اور ملاقاتیں اس خلیج کو نہیں پاٹ سکتیں جو ان کے درمیان حائل ہے۔ فرحت کی عمر اس وقت آٹھ سال کے قریب تھی اور وہ بہت خوبصورت تھی۔ امرار کی چند لڑکیاں جو اپنی ماؤں کے ساتھ اس دعوت میں شریک تھیں اسے اپنی طرف توجہ کرنے میں ایک دوسری سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بڑی عمر کی عورتیں اس کی شکل و صورت اور اس کے لباس سے متاثر تھیں اور وہ کسی کو خالہ جان سلام: اور کسی کو چچی جان سلام: کہہ کر باری باری سب سے دعائیں لے رہی تھی۔ آمنہ کے کوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اس کی

معظم علی اپنا زیادہ وقت عبدالقدوس کے پاس گزارا کرتا تھا۔ ایک دن محمود علی نے جا کر اس سے شکایت کی۔ دیکھیے قبلہ معظم کے مستقبل کے متعلق بہت بڑی توقعات تھیں اور میرزا خلیل تھا کہ آپ کی شادری سے اس کی خداداد صلاحیتیں اور چمک اٹھیں گی۔ لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر مجھے بے حد مایوسی ہو رہی ہے۔ میرزا خیال تھا کہ وہ ایک سو سالہ رہے گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے سوا اسے کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں۔ اگر میں کسی بڑی جائیداد کا مالک ہوتا تو مجھے تمام عمر اس کے گھر بیٹھنے پر اصرار نہ ہوتا لیکن آپ جانتے ہیں میری جائیداد صرف تلواسبہ خدا کے لیے آپ اسے سمجھاتے ہیں!

عبدالقدوس نے اطمینان سے جواب دیا: آپ کو معظم علی کے متعلق مایوس نہیں ہونا چاہیے مجھے یقین ہے کہ وہ دنیا میں نام پیدا کرے گا۔ ایک سلطنت کو سپاہی کی تلوار کے علاوہ عالم کے قلم کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ معظم علی کسی شہر کا قاضی یا صوبے کا حاکم بننے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ آپ اسے پڑھنے کا شوق پورا کرنے دیں، مجھے اس کی خداداد صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔ اس میں اتنی سمجھ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق خود فیصلہ کر سکے۔ اگر آپ نے اپنا کوئی فیصلہ اس پر توپینے کی کوشش کی تو یہ اس کے حق میں مضر ہوگا۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے دیں۔ اگر اس نے اپنی مرضی سے سپاہی بننے کا فیصلہ کیا تو اس میں ان میں بھی عزت اور شہرت کی کوئی منزل اس سے دور نہیں ہوگی!

محمود علی نے مطمئن ہو کر کہا: قبلہ میں معظم سے مایوس نہیں ہوں، لیکن اس کے تمام ساتھی فوج میں شامل ہو چکے ہیں اور لوگ مجھے طعنہ دیتے ہیں:

"لوگوں کی پروا نہ کیجیے، جو نوجوان اپنے لیے نئے راستے تلاش کر رہے ہیں، انہیں اپنی عمر کے ایک حصے میں لوگوں کے طعنہ سنانے ہی پڑتے ہیں!"

عبدالقدوس کے ساتھ ایک طویل بحث کے بعد محمود علی کی پریشانی کسی حد تک دور ہو چکی تھی اور اس کے بعد اگر اس کا کوئی دوست یہ سوال کرتا کہ معظم علی فوج میں کیوں شامل نہیں ہوئے

وہ ایک دوسری کاپی لپٹنے بیٹھنے میں کپن کے واقعات سن رہی تھیں اور فحش گری دلچسپی کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ کبھی آئینہ معظم یا یوسف کی کسی شرارت کا ذکر کرتی تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی تھیں:



وقت گزرتا گیا۔ کپن سے جوانی کی ابتدائی منزل میں قدم رکھے۔ ہی معظم علی کا بھائی یوسف اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے فوج میں بھرتی ہو گئے۔ یوسف ایک سال کی ملازمت کے بعد پچاس سواروں کا افسر بن گیا۔ آصف اور فضل دہلی میں اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے باعث ترقی کی منازل نسبتاً زیادہ تیز رفتار سے طے کر رہے تھے۔ آصف ایک سال کی ملازمت کے بعد دوسرا فضل ایک سو سواروں کا کمان دار بن چکا تھا۔ معظم علی کا باپ محمود علی اس عرصے میں ترقی کر کے محافظ فوج کے ایک ہزار سواروں کا افسر بن چکا تھا۔ اس کے لیے یوسف کی ترقی کی رفتار اطمینان بخش تھی۔ لیکن معظم علی کے مستقبل کے متعلق وہ پہلے جس قدر پرامید تھا۔ اب اسی قدر پریشان ہو رہا تھا۔ معظم علی نے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں سپاہیانہ اوصاف کی کمی تھی۔ محمود علی جانتا تھا کہ اس میں ایک سپاہی کی تمام خوبیاں موجود ہیں: جرات، ہمت، ہوش اور استقلال کے علاوہ وہ ایک غیر معمولی قوت فیصلہ اور بہترین فائز صحتوں کا مالک تھا۔ کتابوں سے دلچسپی کے باوجود اسے سپاہیانہ زندگی پسند تھی وہ ہر روز علی الصبح سواری، نیزہ بازی اور نشانہ بازی کی مشق کیا کرتا تھا۔ تیر کر دیا ہو کر اس کے لیے ایک معمولی بات تھی۔ اسے شکار کا بھی شوق تھا اور اب تک وہ تین شیر اور پانچ چیتے مار چکا تھا۔ لیکن محمود علی جب کبھی اس کے سامنے فوج میں بھرتی ہونے کا مسئلہ چھیڑتا۔ وہ یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرتا: ابا جان! آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔ ابھی میری تعلیم پوری نہیں ہوئی ہے۔ ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اور آئینہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی کہ وہ کہتی: آپ معظم علی کے متعلق اس قدر پریشان کیوں ہیں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے!

سیاہ تھا بالکل قوسے کی طرح۔ اور اس کی ایک آنکھ بھی ذرا چھوٹی تھی؟

”شرم کرو؟“ ماں نے مجھ کو کہا اور منظم اٹھ کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ دو سال پہلے کی ایک ایسی صورت کے دھندلے سے نقوش اس کے ذہن پر ابھر رہے تھے جو شرم بھی تھی اور معصوم بھی۔ چند دن بعد ایک خوشگوار حادثہ پیش آیا۔ منظم علی صبح سویرے کوئی کتاب لینے افضل کے گھر گیا۔ وہ پہلی ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد اندرونی چادر دیواری کے پھانک کے قریب پہنچا تو آصف اور افضل فوجی لباس پہنے باہر نکل رہے تھے۔ دو دو کمرن میں ان کے گھوڑے لیے کھڑے تھے۔

منظم نے انہیں دیکھتے ہی کہا: ”جانی یوسف کتے تھے کہ آج چھٹی ہے اور میں کتاب لینے آیا تھا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

افضل نے کہا: ”آج چھٹی ہے لیکن ہم چوگان کھیلے جا رہے ہیں۔ آؤ تم کتاب لے لو۔“

”لیکن جلدی آنا؟“ آصف نے کہا: ”وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”ابھی آتا ہوں۔“

افضل منظم علی کو ساتھ لے کر کتب خانے کے سامنے پہنچا تو باہر کے برآمدے کی طرف کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔

افضل نے کہا: ”آج آبا جان باہر گئے ہوئے ہیں اور شاید نوکر نے اندر سے یہ دروازہ بند کر دیا ہے آؤ اس طرف پلٹے ہیں۔“

وہ واپس مڑے اور دیوان خانے کے ایک دیسے کمرے سے گزر کر اندرونی صحن کے قریب پہنچے تو منظم کچھ سوچ کر رک گیا۔

افضل نے مڑ کر کہا: ”آجاؤ گھر والے سب اوپر ہیں۔ یہاں کوئی نہیں۔“

منظم علی افضل کے پیچھے صحن سے گزر کر کتب خانے میں داخل ہوا۔ افضل نے کہا: ”آب تم اطمینان سے کتابیں تلاش کرو مجھے دیر ہو رہی ہے میں جلتا ہوں۔“

تو وہ جواب دیتا:

”منظم علی ایک عالم ہے مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے قلم سے بنگال کی زیادہ خدمت کر سکے گا۔“



فرحت گیا نہ سال کی عمر سے پر وہ کیا کرتی تھی اور منظم نے اسے گزشتہ دو سال سے نہیں دیکھا تھا۔ منظم کی ماں بھی کسی اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ اس سے مل کر آئی تو اس نے منظم علی سے کہا: ”بیٹا آج فرحت تمہارے شوق پوچھتی تھی!“

منظم علی کے گال اور کان حیا سے سرخ ہو گئے اور اس نے سوال کیا: ”شوق؟“

”کیا پوچھتی تھی؟“

ماں نے جواب دیا: ”بیٹا وہ یہ پوچھتی تھی کہ تم فرح میں بھرتی کیوں نہیں ہوتے؟“

منظم نے مسکرا کر کہا: ”امی جان مجھے امنوس ہے کہ اب آپ کو میری وجہ سے چھوٹی چھوٹی

روکیوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔“

ماں نے جواب دیا: ”بیٹا اس نے مجھے طعنہ نہیں دیا بلکہ وہ تو اپنی طرف سے بھردہ کی کر

رہی تھی۔ اور اب وہ چھوٹی لڑکی نہیں۔ ماشاء اللہ اب وہ جوان معلوم ہوتی ہے اس کی ماں اس

کی پیدائش کے دن سے اس کی شادی کی تیاریاں کر رہی ہے۔ مگر شاید کے بڑے بڑے

گھرانوں سے رشتے آتے ہو۔ لیکن کسی کو خاطر یہ نہیں مانتی اور فرحت ہے جس اس قابل کہ

کسی نواب کے گھر جائے۔ مرزا صاحب بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کریں گے۔ لیکن

سے مرزا صاحب کے کسی عزیز نے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگا تھا۔ اور حسین بیگ بھی ضامن

ہو گئے تھے۔ لیکن فرحت کی ماں نہیں مانتی۔“

منظم جانتا تھا کہ اس کی ماں فرحت سے بہت پیار کرتی ہے اور فرحت کا ذکر آجائے

تو اس کی تین ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر شرارت آمیز تسمیہ لاتے ہوئے

دل کو چلنے کی نیت سے کہا: ”امی جان! فرحت وہی لڑکی تو نہیں جس کی ناک چھٹی اور دمک

کی بیٹی تھی اور وہ اتنا شاعر نہ تھا کہ زمین پر کھڑا ہو کر ستاروں سے باتیں کرتا ہے۔

کوئی آدھ گھنٹہ کی تلاش کے بعد معظّم ایک کتاب لے کر باہر نکلا تو برآمدے کے آخری سر پر پہنچ کر اسے حسین بیگ دکھائی دیا۔ معظّم نے بڑھ کر اسے سلام کیا اور حسین بیگ نے حکیم لکھنؤ کے مصنف کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ معظّم علی نے کہا: میں یہ کتاب لینے آیا تھا۔

برآمدے میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حسین بیگ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: معظّم بیٹے جاؤ میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

معظّم علی اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قدرے وقف کے بعد کہا: "برخوردار تمہارے متعلق مجھے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ کتابوں سے دلچسپی کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے باقی فرائض سے اسکی بند کرو۔ ابھی شاہی محل کے باہر تمہارے ابا جان ملے تھے۔ مجھے ان کی باتیں سن کر بڑا افسوس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ تم ایک سپاہی بن کر اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے۔ شیری علی تمہارے متعلق کہا تھا کہ تم کسی دن سپہ سالار بنو گے۔ لیکن تم کتابوں کے شوق میں خدا داد صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو۔ آخر تم فوج میں شامل ہونے سے کیوں ڈرتے ہو؟ جسمانی لحاظ سے تم بنگال کے ہزاروں نوجوانوں کے لیے قابل رشک ہو۔ نیزہ بازی، شمشیر بازی اور نشانہ بازی میں بہت کم نوجوان تمہارا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تمہیں خدا نے ذہانت بھی دی ہے، اگر تم اپنے بھائی کی طرح دو سال قبل فوج میں شامل ہو گئے ہوتے تو اب تک شاید دو سو سو تھارے قہار کمان میں ہوتے۔ لیکن اگر تمہیں ایک معمولی انسر کی حیثیت سے فوج میں شامل ہونا پسند نہیں تو میں تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔ علی مددی خاں کے ساتھ میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ میری مدد اور دست ہے۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی تمہیں اس کے پاس لے چلا ہوں۔

معظّم علی نے کچھ دیر سوچا کہ جواب دینے کے بعد کہا: چچا جان میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے ابتدائی

افضل باہر کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔ معظّم نے ایک الماری کھولی اور کتابیں نکال نکال کر دیکھنے لگا۔ دو تین الماریوں کو دیکھنے کے بعد وہ کونے کی ایک الماری کے پاس کھڑا ایک کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔ اچانک اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ اور معظّم بعد ایک دلکش نسوانی آواز سنائی دی: بھائی جان آپ ابھی تک ...؟

معظّم علی نے مڑ کر دیکھا اور ایک نائیک کے لیے حیرت سا ہو کر رہ گیا۔ ایک نو عمر لڑکی جسے خیالی میں کمرے کے درمیان پہنچ چکی تھی اس کی نسبت کہیں زیادہ بدحواسی کے ساتھ ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کر رہی تھی۔ معظّم علی ایک نظر سے زیادہ اس کی طرف نزدیکہ سکا۔ اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا:۔

معاف کیجیے میں ...؟

معظّم علی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ لڑکی فوراً مڑ کر دروازے کی طرف بھاگی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ روشنی کی کرن کی طرح جو آئینے کو چھونے کے بعد اپنا رخ بدل لیتی ہے یا سمنڈ کی لہر کی طرح جو ساحل سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے۔

یہ لڑکی فرحت تھی۔ معظّم علی نے اسے دو سال کے بعد دیکھا تھا اور وہ بھی ایک لڑکے کے لیے۔ اس کے ذہن میں اس کے کوئی واضح نقش نہ تھے۔ تاہم اسے یہ احساس ضرور تھا کہ اگر وہ اسے تمام عمر دیکھتا رہتا تو بھی اس کی نگاہوں کی تشنگی دور نہ ہوتی۔ وہ اپنے دل میں ایک خوشگوار دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن یہ دھڑکن چند لمحوں سے زیادہ نہ رہی۔ معظّم علی ہوائی قلعے تعمیر کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ انتہائی سکون کے ساتھ الماری سے ایک اور کتاب نکال کر دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کا یہ خوشگوار تصادم اس کے نزدیک محض ایک حادثہ تھا۔ ماضی کا حادثہ جس کا اس کے حال اور مستقبل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی میں ان کے راستے ایک دوسرے سے جدا ہیں، اور اگر وہ جھٹک کر تھوڑی دیر کے لیے کسی جگہ رہے پر ایک دوسرے سے اطمینان تو بھی ان کی منزل کبھی ایک نہیں ہو سکتی۔ فرحت مرزا حسین بیگ

کرنا چاہتا۔ میں جس فوج کا ادنیٰ سپاہی بننا پسند نہیں کرتا اس کا سپہ سالار بننا بھی پسند نہیں کروں گا۔ جس دن مجھے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ میں ایک سپاہی بن کر قوم اور وطن کی کوئی خدمت سرانجام دے سکتا ہوں۔ اس دن میرے سامنے یہ سوال نہیں ہوگا کہ میں ایک سپاہی ہوں یا سپہ سالار میرے سامنے صرف یہ سوال ہوگا کہ میں نے جس مقصد کے لیے تلوار اٹھائی ہے وہ کس حد تک پورا ہو رہا ہے۔ اپنے ضمیر کا اطمینان میرے لیے سب سے بڑا انعام ہوگا۔

حسین بیگ نے کہا: "اور وہ دن کب آئے گا جب تم قوم اور وطن کے لیے تلوار اٹھانے کی ضرورت محسوس کرو گے؟"

مستظم علی نے جواب دیا: "جب ہماری قسمت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی جو اجتماعی حیات کے اصولوں پر یقین رکھتے ہوں۔ موجودہ دور میں ہماری سب سے بڑی بیماری ہماری لامرکزیت ہے اور اس لامرکزیت کا باعث ان بیشمار طالع آزمائوں کی ہوس اقتدار ہے جو ہندوستان کو اپنی چھوٹی چھوٹی شکار گاہوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔ موجودہ حالات میں ایک سپاہی کی تلوار چند امرار کی مسندوں کی حفاظت کر کے ان کے اقتدار کی مدت میں چند مہینوں یا چند برسوں کا اضافہ کر سکتی ہے لیکن قوم کی اجتماعی بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔"

حسین بیگ اس قسم کی گفتگو سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے قدسے تلخ ہو کر کہا: "ہماری گفتگو بنگال کی فوج کے متعلق تھی جو ایک طرف مرہٹوں کی لوٹ مار اور دوسری طرف الیٹ انڈیا کمپنی کے چارہ زہ عزائم کے خلاف ہمارا واحد مددگار ہے۔"

مستظم علی نے جواب دیا: "جی ہاں، لیکن جتنی سے علی دردی خاں کی فوج کے سپاہیوں اور برہمنوں کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ بنگال کے دوست کون ہیں اور دشمن کون ہیں؟

حسین بیگ فطرتاً حکومت پسند تھا اور علی دردی خاں اسے اُسے غایت درجہ کی عقیدت تھی۔ وہ بنگال کے حکمران کی ذات کو تنقیداً تبصرے سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس نے انتہائی گوشش کے ساتھ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا: "برخوردار مجھے امید ہے کہ علی دردی خاں کے متعلق بات کرتے وقت

تم سنجیدگی کا ثبوت دو گے اور اس بات کا لحاظ رکھو گے کہ وہ ہمارا حکمران ہے۔"

مستظم علی نے کہا: "چچا جان معاف کیجیے، میں نے علی دردی خاں کی ذات کے متعلق ابھی تک کچھ نہیں کہا، بیشک وہ ہمارا حکمران ہے۔ لیکن اگر کوئی حکومت اپنے عمل پر نکتہ چینی کا حق مجھے نہیں دیتی تو وہ مجھ سے اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے علی دردی خاں کی بہت سی غریبوں کا اعتراف ہے۔ ملک کے کئی دوسرے حکمرانوں سے وہ یقیناً بہتر ہیں۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس سلطنت کی مرکزی قوت نہ ہونے کے برابر ہو وہ زیادہ دیر کی قوم کی آزادی اور بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ آپ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ دہلی میں مسلمانوں کی سطوت کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں اور عالمگیر کی عظیم سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے گھر وندے تعمیر کرنے والے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی جدوجہد کسی اجتماعی نصب العین کے حصول کے لیے نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی اغراض کے لیے ہے۔ مسلمان صدیوں کی حکومت کے بعد نہایت التوم اب بتدریج اس تباہی کا سامنا کر رہے ہیں جو آتش راہ اور لامرکزیت میں مبتلا ہونے والی اقوام کی آخری سزا ہوتی ہے۔"

حسین بیگ نے کہا: "عالیچ کے جانشین نااہل ہیں اور اب اگر تم دہلی کے دوبار کی حالت کو تو علی دردی خاں جیسے لوگوں کا دم غنیمت سمجھو گے۔ اگر ایسے لوگ دہلی کے نااہل اور منہوج حکمرانوں سے مایوس ہو کر اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کرتے تو اب تک سارا ملک ہمارے دشمنوں کے قبضے میں چلا جاتا۔ آج مرشد آباد، مکھنوا اور حیدر آباد کے حالات یقیناً دہلی کے حالات سے بہتر ہیں۔ آپ درست کہتے ہیں لیکن آپ آج کی بجائے کل کے متعلق سوچیں۔ درخت سے کٹی ہوئی شاخیں زیادہ دیر سبز نہیں رہتیں۔ میں اورنگ زیب عالمگیر کے نااہل جانشینوں سے کہیں زیادہ ان قسمت آزمائوں کو موجودہ حالات کا ذمہ دار سمجھتا ہوں جن میں کسی اچھے حکمران کو مندر حکومت پر بٹھانے کی جرات و ہمت یا دیانت نہ تھی۔ دلی کے نااہل، منہوج اور بے بس حکمران ان کی مردہ سیاست کی پیروی کرتے۔ لال قلعہ ان کے لیے زور آزمائی کا کھارہ تھا۔ بادشاہوں

کے تاج زن کے ہاتھوں کے کھولنے تھے۔ ہر گروہ کی یہ خواہش تھی کہ وہ بی کے حکمران کی حیثیت ایک بے بس دعا گو سے زیادہ نہ ہو۔ اور وہ اس کی سرپرستی میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ ایک گروہ کسی نااہل حکمران کو اپنی بساط سیاست کا مہرہ سمجھ کر تخت پر بٹھاتا تھا اور دوسرا گروہ اسے تخت سے اتار کر اس سے زیادہ نااہل امیدوار کے سر پر تاج رکھنے کی جدوجہد شروع کر دیتا تھا۔ اگر ان حالات سے فائدہ اٹھا کر دہلی سے باہر چند صوبہ داروں نے اپنے سردوں پر چھوٹے چھوٹے تاج رکھ لیے ہیں تو ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔

اگر دہلی کے امراء نیک نیت ہوتے اور ان کی سیاست قوم کے اجتماعی مفاد کے تابع ہوتی تو وہ یقیناً اپنی ذاتی سودا بازیوں کی خاطر نااہل حکمران تلاش نہ کرتے۔ انھوں نے جس مستعدی کے ساتھ چند فرائض عملی حکمرانوں کو تخت پر بٹھانے کی جدوجہد کی تھی۔ اگر اسی مستعدی کے ساتھ کسی اجتماعی نصب العین کے حصول یا کسی ضابطہ اخلاق کی فتح کو اپنے لیے جدوجہد کرتے تو وہ دہلی کے تخت کے لیے بہترین حکمران تلاش کر سکتے تھے لیکن وہ کسی مہول یا ضابطہ اخلاق کی فتح کو اپنی ذاتی خواہشات پر شکست سمجھتے تھے۔ وہ کسی مہول یا مقصد کے لیے قربانی دینے کی بجائے ہر مہول اور مقصد کو اپنی ذاتی خواہشات پر قربان کرنا سیکھ چکے تھے۔ دہلی کی سلطنت کے زوال کی وجہ صرف یہی نہیں کہ اس کے حکمران بڑے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بے ضابطہ سلطنت کے ستون کھاتے تھے ہر برائی میں اپنی جھلائی تلاش کرتے تھے۔

حسین بیگ کے لیے معظّم علی کی گنگو کا صرف وہ حیدر قابل قورچ تھا جو بنگال اور دہلی دردی خاں کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ دہلی کے امراء سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی اور معظّم علی اگر ان کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرتا تو بھی اسے اعتراض نہ ہوتا۔ اس نے کہا: ہر خوردار مجھے دہلی کے امراء یا حکمرانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر انھوں نے برائی کا بیج بویا تھا تو انھیں کئی بار اس کی سزا ملی چکی ہے۔ دہلی کئی بار مر جوں اور جاؤں کے ہاتھ لٹ چکا ہے لیکن ہمیں ان لوگوں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے ایسے حالات میں بھی بنگال، اودھ اور دکن کو تباہی سے بچا لیا ہے۔ وہ ہمارے دشمن ہیں۔ بنگال میں علی دردی خاں ہماری عزت اور آزادی کا آخری محافظ ہے۔ خدا

کرے اس کا سایہ چند برس اور ہمارے سر پر ہے اور تم جیسے فوجان بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساں کریں!۔

حسین بیگ ان الفاظ پر اس ناخوشگوار بحث کو جو اس کے لیے کافی حد تک ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی، ختم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن معظّم علی نے کہا،

بچا جان آپ بڑا زانیں مستقبل کے مورخ ان صوبہ داروں کو موجودہ صورت حالات کی خرابی سے بری الذمہ قرار نہیں دیں گے جنھوں نے دہلی کے دیہات کی سازشوں سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کو اس میں تقسیم کر لیا ہے۔ آگماں میں سے کوئی پوری سلطنت پر قبضہ کر لیتا اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ قوم کو تباہی سے بچایا جائے تو کم از کم میں اس سے اس کا حسب و نسب نہ پوچھتا۔ اگر وہ اپنے کردار سے قوم کا نجات دہنہ ثابت ہوتا تو میں ایک رضا کار کی حیثیت سے اس کے جھنڈے تلے جان دینا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا۔ اس کی فوج کا معمولی سپاہی بن کر مجھے یہ اعتماد ہوتا کہ جب وہ کوئی غلط قدم اٹھائے گا تو میں اسے روک سکوں گا۔ اس کی انگلیں میری انگلیں ہوتیں، اس کے دل کی دھڑکیں، میرے دل کی دھڑکیں اور اس کے ضمیر کی آواز میرے ضمیر کی آواز ہوتی۔ اور اس کی شکست کو میں اپنی شکست سمجھتا۔ پھر ایسے شخص کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے طالع آزمائی کے کسی گروہ کی حمایت کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ ایک مقصد کے لیے ایسا رادہ دہی کا دولہ لے کر میدان میں نکلتا اور عوام کی اجتماعی قوت اس کے ساتھ ہوتی۔ وہ عوام کے لیے جھوپڑ سے تعمیر کرتا اور اس کے اقتدار کی سند مر مریں ایوانوں کی بجائے ان کے دلوں میں ہوتی۔ لیکن یہ لوگ جنھیں آپ قوم کا نجات دہنہ خیال کرتے ہیں۔ مجھے کسی ایسے اجتماعی اصول کے ملبورانہ نظر نہیں آتے جس کی فتح کو قوم کی فتح سمجھ سکوں۔ یہ لوگ ہمارے احساس اور شعور کی بجائے ہماری بے حس کی پیداوار ہیں۔ ان کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر اوپر چلیں ہوتی ہیں اور جیسے گرنے کے لیے ہوا کا ایک جھونکا کافی ہوتا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیں مر جوں کی لوٹ مار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوس ملک گیری سے بچانا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت

نہیں کردہ ایک دن مرہٹوں کے غلات جگ کرتے ہیں اور دوسرے دن ان کے دوست بن جاتے ہیں اور اگر مرہٹے انھیں مدد دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو وہ اپنے مسلمان ہمسایہ پر حملہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ انگریز ہماری آزادی کے بدترین دشمن ہیں۔ لیکن ان میں سے کون ہے جس نے اپنی کسی نہ کسی ذاتی مصلحت کے پیش نظر انگریزوں کو اس ملک میں پاؤں جمانے کے لیے مدد نہیں دی؟ ان کا منہائے نظر صرف ذاتی اقتدار ہے اور بھجے ڈرہے کہ ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لیے یہ لوگ کسی دن قوم کی بنا کو بھی داؤں پر لگا دیں گے۔

حسین بیگ نے جھجھکا کر کہا: تم ملی دردی خاں کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ انگریزوں یا مرہٹوں کے ساتھ کوئی ساز باز کر سکتا ہے یا قوم کی آزادی کو داؤں پر لگا سکتا ہے۔

حسین بیگ کے تیرہ دیکھ کر معظم چند تانیے خاموش رہا۔ بالآخر اس نے کہا: بچا جان میں نے یہ باتیں اس لیے کہی ہیں کہ میں آپ کی بے عزت کرتا ہوں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ملی دردی خاں کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن موجودہ حالات سے آپ میری نسبت کہیں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ انگریزوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن میں جس چیز کو خطرناک سمجھتا ہوں وہ ان کی مصلحتیں ہیں۔ ایک ایسے حکمران کی مصلحتیں، جس کا اقتدار کسی مقصد کے لیے جہد جہد کا ثمر نہیں بلکہ اپنی ذاتی ذہانت اور مصلحت عملی کا نتیجہ ہے جو لوگ کسی مقصد کیلئے جہد جہد کرتے ہیں، ان کی سب سے بڑی پونجی وہ قربت یا فترائے عام ہوتی ہے جسے وہ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے بیلہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اقتدار اگر لوگوں کی بھلائی کے لیے ہو تو عوام کا اجتماعی شعور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر ان کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو تو رستے عامر ان کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے قسمت آزمائش کے لوگوں سے جوڑ توڑ یا سوسے بازی کی مزدورت پیش نہیں آتی۔ ان کے دوستوں اور ساتھیوں کو ساری قوم اپنے دوست سمجھتی ہے۔ ان کے دشمن سب کی نگاہوں میں دشمن ہوتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اپنی تمام ذاتی خوبیوں کے باوجود ملی دردی

خاں کا شمار ایسے لوگوں میں نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے صرف اپنی ذاتی قابلیت یا ہوشیاری کے بل بوتے پر حکومت حاصل کی ہے۔ اور اس حکومت کے تحفظ کے لیے بھی وہ چند ہوشیار آدمیوں کی حمایت یا دوستی کا کافی سمجھتے ہیں۔ بنگال کو جب کوئی آمدنی خطرہ پیش آتا ہے تو وہ انگریزوں یا مرہٹوں کی معاندانہ سرگرمیوں سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی بیرونی خطرہ درپیش ہو تو وہ اپنے بدترین غداروں کو بھی معاف کر کے پکامادہ ہو جاتے ہیں۔ بیشک وہ ایک ہوشیار سیاست دان اور تجربہ کار جرنیل ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بنگال کے سپاہی کا بھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا اصل حامی کون ہے۔

حسین بیگ کا چہرہ غصے سے متما رہا تھا۔ اس نے انتہائی مضبوط سے کام لیتے ہوئے کہا:

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملی دردی خاں انتہائی ناقابل اعتماد آدمی ہے جو حسبِ مزدورت اپنے دوست اور دشمن بدلتا رہتا ہے؟“

مسلم علی نے جواب دیا: میں نے ملی دردی خاں کو ناقابل اعتماد نہیں کہا لیکن اگر آپ بڑا نہایت تیرہ مزدوروں کا ان کے گرد ایسے آدمی جمع ہیں جنہیں میں قابل اعتماد نہیں سمجھتا اور اگر ان کے سامنے ایک حکمران کی ذاتی مصلحتیں نہ ہوتیں تو ان کے بدلہ میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ ہوتی۔“

حسین بیگ نے کہا: ادرم یہ بھی کہتے ہو کہ ملی دردی خاں کے سپاہیوں کو یہ علم نہیں کہ ان کا حامی کون ہے؟“

”جی ہاں اور میں غلط نہیں کہتا!“
”شاید ملی دردی خاں کو بھی یہ علم نہ ہو کہ ان کا حامی کہاں ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے بتاؤ ادرم اس کے کانوں تک تمہاری یہ آواز پہنچاؤں؟“

معظم علی نے حسین بیگ کی طنز سے بھری ہوئی مسکراہٹ کی کوئی پروا نہ کی۔ اس نے جواب دیا: ”جی انھیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میرے جیسے لوگ کسی کے فائدہ نہیں ہو سکتے۔“

سین بیگ کو میر جعفر کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی تاہم وہ علی درودی خاں کی فوج کے ایک افسر کے بیٹے کی زبان سے اس کے خلاف کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا: ”دیکھو برادر اگر تم فوج میں شامل نہیں ہونا چاہتے تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا لیکن علی درودی خاں کے ساتھیوں کے متعلق زبان کھولنے دقت تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔ یہ لوگ سلطنت کے ستون ہیں اور تمہارا والد فوج کا ملازم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہارے خیالات اس قدر بغیانہ ہیں۔ میں نے انتہائی ضبط سے کام لے کر تمہاری باتیں سنی ہیں۔ لیکن اس مکان کی چار دیواری سے باہر اگر تم نے کسی کے ساتھ اس قسم کی باتیں کیں تو تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ تم انھیں اور آصف کے دوست ہو اور میں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم ان کے سامنے ایسے خیالات کی تبلیغ کرو۔ تم ابھی بچے ہو۔ لیکن دقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ علی درودی خاں بنگال کے مسلمانوں کا آخری سہارا ہے۔“

معظم علی نے کرسی سے اٹھ کر کہا: ”چچا جان اگر میں نے کوئی تیغ بات کہہ دی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن آپ یقین رکھیں دقت آنے پر میں یہ ثابت کر سکوں گا کہ بنگال کے مسلمانوں کا مستقبل مجھے کسی سے کم عزیز نہیں ہے۔“

اگلے روز معظم اور یوسف اپنے باپ کے ساتھ مشاعرے کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ حسین بیگ کے نوکر نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ رک گئے اور نوکر نے قریب آکر محمد علی سے مرزا صاحب نے آپ کو دفرمایا ہے۔

محمد علی نے نوکروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”تم جاؤ میں ان سے مل آؤں۔“

محمد علی نوکر کے ساتھ چلا گیا تو یوسف نے معظم علی سے کہا: ”معظم تمہارا صاحب نے مجھ پر کچھ دست بلایا ہے۔ خیر تو ہے؟“

معظم نے جواب دیا: ”بھائی جان معلوم ہوتا ہے آج میری شامت آئے گی۔ کیوں کیا ہوا؟“

”کل میری باتوں سے مرزا صاحب خفا ہو گئے تھے۔“

”کیوں، تم نے ان سے کیا کہا تھا؟“

”وہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کے متعلق پریشان تھے۔ اور میں نے ان کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”اور اب وہ زیادہ پریشان ہوں گے۔ تم نے علی درودی خاں کے متعلق ضرور کوئی ایسی دسی بات کہی ہوگی؟“

”میں نے موجودہ حالات پر تبصرہ کیا تھا اور انھوں نے شاید یہ سمجھا کر میں علی درودی خاں کی حکومت کا باقی ہوں۔“

”تمہیں مرزا صاحب کے ساتھ نہیں الجھنا چاہیے۔ وہ پرانی دھن کے آدمی ہیں، اور علی درودی خاں کے ساتھ ان کے مراسم بہت گہرے ہیں۔“

یوسف اور معظم نے نماز کے بعد کچھ دیر محمد علی کا انتظار کیا اور پھر گھر کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچ کر وہ صحن میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محمد علی بھی آگیا اور اس نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کسی تمہید کے بغیر کہا: ”معظم! تم نے کل مرزا صاحب سے کیا باتیں کی تھیں؟“

”ابا جان میں نے ان کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی کہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ خوف یا کاہلی ہے۔ مرزا صاحب بہت زیادہ خفا تو نہیں تھے؟“

”نہیں بلکہ وہ اس بات پر پریشان تھے کہ وہ تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئے تاہم

دوسرا باب

ایک دن مرشد آباد میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پنڈت بھاسکر کی قیادت میں رانگھو جی بھونسلی کی چالیس ہزار مرہٹہ فوج برہمان کی طرف بڑھ رہی ہے علی مددی خاں مرشد آباد سے باہر شکا رکھل رہا تھا۔ اس نے مرہٹوں کی پیش قدمی کی خبر پڑنے ہی پر دو ان کا رخ کیا اور مرشد آباد اور دوسرے شہروں کی افواج کو یہ حکم بھیجا کہ وہ راستے میں اس کے ساتھ آئیں۔ دودن کے اندر اندر مرشد آباد کی چھاؤنی خالی ہو گئی اور سپاہیوں کے صرف چند دستے شہر اور شاہی محل کی حفاظت کے لیے رہ گئے۔ چند دن بعد یہ خبر آئی کہ علی مددی خاں کا ایک کمان دار میر محبوب اور فوج کے چند اور افسر بنگال سے غزلی کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گئے ہیں اور پنڈت بھاسکر نے یہ اطلاع کی ہے کہ بنگال کی فوج سے غزلی کرنے والوں کو مرہٹہ فوج میں اپنے سابقہ عہدوں پر لے لیا جائے گا۔ مرشد آباد میں سراپکی پھیلی ہوئی تھی۔

عمود علی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے آصف بیگ اور افضل مرشد آباد کی فوج کے ساتھ محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

معظم علی کو پہلی بار نہایت شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوا کہ غلے کے وہ لوگ جن کے بیچ جنگ کے لیے جا چکے ہیں۔ اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

شاہی محل کا دروازہ معظم علی کے باپ کا دوست تھا اور وہ ہر روز علی الصبح اس کے پاس جنگ کے تازہ حالات معلوم کرنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ دروازے

وہ تاکید کرتے تھے کہ تمہیں سی دودی خاں اور ان کے اصرار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

معظم علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا: ابا جان انہوں نے یہ تو ضرور کہا ہو گا کہ میں بہت نالائق ہوں؟

نہیں! وہ یہ کہتے تھے کہ تمہارا بیٹا میرے لیے ایک معنا ہے کبھی میں یہ عسکر کرتا ہوں کہ وہ ایک سادہ دل فوجان ہے اور کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہے۔ وہ کہتے تھے ایسے فوجان یا تو دنیا میں نام پیدا کرتے ہیں اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتے ہیں۔

معظم علی نے کہا: ابا جان میں بھائی جان سے ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ وہ میری شکایت کریں گے اور آپ گھر آکر میری خوب مرمت کریں گے۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ وہ آٹھو بجے اپنے گھر کی چار دیواری کے قریب نہیں پہنچنے دیں گے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی ہلچلے آدمی ہیں۔ تم نے ان سے میرے جگر کے خلاف کچھ کہا تھا؟

جی ہاں:

وہ ہر اس آدمی کو اچھا سمجھتے ہیں جو میرے جگر کو برا خیال کرتا ہے۔

لیکن انہوں نے مجھے تو ڈانٹ دیا تھا۔

یہ ان کی ظاہر داری تھی لیکن تمہیں ایسے خیالات کسی اور کے سامنے ظاہر نہیں کرنے چاہئیں:

ابا جان میں محتاط رہوں گا۔

مرزا صاحب ایک اور بات کہتے تھے:

وہ کیا؟

وہ کہتے تھے کہ معظم علی کے لیے میرے کتب خانے کا دروازہ ہر وقت کھلا رہے گا۔

لیکن مجھے اس میں خوشی ہوئی جب میرے آٹھو خانے سے کواں میرے اہل سے گھر لائے گئے گا؟

مل کر واپس آیا تو اسے اپنی ماں کا چہرہ بے حد مغموم دکھائی دیا۔

”کیا ہوا اتنی جان؟“ اس نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں بنیا! کوئی اچھی خبر آئی ہے؟“

”ہاں اتنی جان آج کی خبریں کچھ اچھی ہیں۔ مرنے چنڈھڑ پوں کے بعد پیچھے ہٹ گئے

ہیں لیکن ابھی کوئی فیصلہ کن معرکہ نہیں ہوا۔ آپ اس قدر لیگن کریں ہیں؟“

”بیٹا! ماں نے مغموم لمحے میں جواب دیا: ”مجھے فرحت سے یہ توقع نہ تھی!“

”کیا ہوا اتنی جان؟“ مظلم نے پھر اس ہو کر سوال کیا۔ ”فرحت نے کیا کہا؟“

”اس میں فرحت کا تصور نہیں بیٹا۔ اصل میں وہ لڑکیاں جو اس کے ساتھ آئی تھیں بہت

بدتمیز تھیں۔“

”فرحت یہاں آئی تھی؟“

”ہاں وہ ابھی گئی ہے۔“

”آخر کیا کیا اس نے؟“

”ماں نے اٹھ کر ایک الماری سے کپڑے کی چند چوڑیاں نکالیں اور مظلم علی کو دکھاتے ہوئے

کہنے لگی: ”فرحت آج اپنی چند سیلیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اس کے ساتھ سلطان خاں کی

لڑکی بھی تھی۔ مجھے وہ کبھی پسند نہیں آئی۔ لیکن آج اس نے بہت زیادتی کی۔ پیسے اس نے یہ

کہا کہ تم بزدلی کی وجہ سے فوج میں شامل نہیں ہوئے، پھر اس نے اپنی چوڑیاں تار کر میرے سلنے

رکھ دیں اور کہنے لگی: ”مظلم جانی کو ہماری طرف سے یہ تحفہ دے دیجیے۔“

”تھوڑی دیر کے لیے مظلم علی کی رگوں کا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں آگیا۔ اس نے

کہا: ”اور فرحت نے کیا کہا؟“

”فرحت نے کچھ نہیں کہا مجھے توقع تھی کہ وہ اپنی سیلیوں کا منہ بند کرے گی۔ لیکن وہ

خاموشی سے ہنستی رہی۔“

”اتنی جان اگر آپ کو ایسی باتوں سے صدمہ ہوتا ہے تو میں اکیلا مرٹھوں کے لشکر کے سامنے

کھڑا ہو جاؤں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔ وقت آنے پر کوئی آپ کے بیٹے کو بزدل نہیں کے گا اور

وہ سلطان خاں جس کی صاحبزادی نے آپ کو میرے لیے چوڑیاں دی ہیں خود مرٹھوں کے

حملے کی خبر سنتے ہی شہر سے ہجرت کے لیے تیار ہو گیا تھا اور میں نے اسے بڑی مشکل سے دکا

تھا۔ اتنی جان میں فوج کے ساتھ اس لیے نہیں گیا کہ موجودہ حالات میں میرا مرٹھ آباد میں رہنا

زیادہ ضروری ہے۔ شہر سپاہیوں سے قریباً خالی ہو چکا ہے۔ اگر دشمن نے اس صورت حال سے

فائدہ اٹھا کر چند تیز رفتار دتے اس طرف بھیج دیے تو یہ عمل تو درکنار شاہی محل بھی محفوظ نہیں

رہے گا اور شہر سے باہر ہمارا عمل تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں مرزا صاحب کے پاس جا رہا ہوں

۔ لیکن بیٹا خدا کے لیے فرحت کی شکایت نہ کرنا۔ اس کی نیت بری نہ تھی۔“

”مظلم علی نے کہا: ”میں امی جان میں آصف اور افضل کی بہن کی شکایت نہیں کر سکتا

لیکن یہ چوڑیاں سنبھال کر رکھیے۔“



”مظلم علی، حسین بیگ کے محل میں داخل ہوا تو وہ بیرونی احاطے میں بندوبست سے نشانہ بازی

کر رہا تھا اور آٹھ دس سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے۔ مظلم علی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور جب

حسین بیگ اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا: ”

”چچا جان آج میں کتب خانہ کی بجائے آپ کا اسلحہ خانہ دیکھنے آیا ہوں۔“

”حسین بیگ مسکرایا۔ ”تمہیں تو اس کی ضرورت ہے یا بندوبست کی؟“

”ابھی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کے کتب خانے میں ڈیڑھ ہزار کتابیں ہیں۔ میں یہ

جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے اسلحہ خانے میں کتنا سامان ہے؟“

”اگر استعمال کرنے والے ہوں تو سامان بہت ہے۔ لیکن میں تمہاری اس اپانک

موجی کی وجہ نہیں سمجھ سکتا۔“

مستقل ملی نے جواب دیا: شہر فوج سے خالی ہو چکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر دشمن نے ہوشیاری سے کام لیا تو مرشد آباد پر اپنا قبضہ کر لینا اس کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ اور یہ محلہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو آپ کا مکان اس محلے کے لیے قلعے کا کام دے سکتا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر مجھے کسی فوجی عہدہ کی ضرورت ہو تو آپ میری سفارش کر سکتے ہیں۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس قلعے کا محافظ مقرر کر دیا جائے۔

حسین بیگ نے کہا: لیکن میرے پاس صرف پندرہ تربیت یافتہ سپاہی اور پانچ چھ بیکار نوکر رہ گئے ہیں۔ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو تم اتنے آدمیوں کے ساتھ کیا کر سکو گے؟ آدمیوں کی فوج نہ کیجیے۔ خطرے کے وقت محلے کا ہر آدمی یہاں پہنچ جائے گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انھیں تربیت دینے کا موقع مل جائے۔ انھیں اسلحہ اور بارود کی ضرورت ہوگی اور یہ فراہم کرنا آپ کا کام ہوگا۔

”برغور دار تم نے میرا اسلحہ خانہ نہیں دیکھا۔ میرے پاس کوئی اڑھائی سو بندوقیں اور قریباً اتنے ہی پستول اور تھواریں ہیں۔ بارود اتنا ہے کہ اگر استعمال کرنے والے ہوں تو وہ ایک ہفتے میں بھی ختم نہیں ہوگا۔ دو توپیں جو میں نے پانچ سال قبل خریدنی تھیں اندر پڑی ہوئی ہیں اور آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ انھیں کہاں نصب کیا جائے۔ اب اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو یہ فیصلہ اس قلعے کا محافظ کرے گا۔“

”تو آپ کو میری خدمات منظور ہیں؟“

حسین بیگ نے ہنستے ہوئے جواب دیا: ”مستقل ملی میں تمہیں اپنے قلعے کا محافظ اور اپنی ان افواج کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں جن کی تعداد ستر دست پندرہ تربیت یافتہ اور چھ غیر تربیت یافتہ سپاہیوں سے زیادہ نہیں۔“

مستقل ملی نے کہا: ”آپ کا سپہ سالار آپ کو واپس نہیں کرے گا۔“

حسین بیگ نے معظم کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا: ”میں میں تم سے کبھی واپس نہ تھا۔“

مستقل نے کہا: ”میں آج ہی اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ آج شام آپ محلے کے باہر لوگوں کو یہاں جمع ہونے کی دعوت دیں!“

”بہت اچھا، لیکن میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنا کام یہ خیال کیسے آیا ہے کہ مرشد آباد کو واقعی کوئی خطرہ ہے؟“

”چچا جان اگر خطرہ نہ ہو تو بھی ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ ابھی آپ نشاد بازی کی مشق کر رہے تھے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ آپ سنگامی حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہتے ہیں۔“

حسین بیگ نے جواب دیا: ”یہ درست ہے کہ محاذ پر اپنے سپاہی بھیج دینے کے بعد مجھے کبھی کبھی یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ اگر کوئی سرپرہ اس طرف آنکے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ ہمارے گھر میں فوجت ایسی باتیں سوچا کرتی ہے جس دن سے آصف اور افضل گئے ہیں۔ وہ صبح شام باقاعدہ نشاد بازی کی مشق کیا کرتی ہے۔ ایک دن اس نے خواب دیکھا تھا کہ دو ہمارے گھر میں گھس آئے ہیں۔ احتیاط کرنا اچھی بات ہے تاہم میں یہ نہیں سمجھتا کہ مرہٹے محاذ جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکسے۔ لیکن تم اس مسئلہ میں بہت سنجیدہ ہو اور تمہاری باتوں سے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرہٹوں کا لشکر واقعی مرشد آباد کا رخ کر رہا ہے۔“

مستقل ملی نے کہا: ”چچا جان میرے خدشات بلاوجہ نہیں۔ مرہٹے فتح کی بجائے لوٹار کے لیے آئے ہیں۔ اب تک انھوں نے اپنے راستے کی بستیوں اور شہروں کو برباد کیا ہے لیکن بہت کم مقامات ایسے ہیں جن پر انھوں نے قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ بنگال کی زیادہ دولت مرشد آباد میں ہے اور ہمارے مدار

صرف دس آدمی ایسے تھے جنہیں حسین بیگ اور معظم علی کے خیالات سے پوری طرح اتفاق تھا اور انہوں نے ان کے ساتھ صدق دل سے تعاون کا وعدہ کیا۔

اگلے دن صرف بیس نو عمر لڑکے اور تیس بڑی عمر کے آدمی جن میں سے اکثر محلے کے غریب دکاندار، مزدور اور چند امیر گھروں کے نوکر تھے۔ حسین بیگ کے مکان پر حاضر ہوئے حسین بیگ کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن معظم علی کے نزدیک یہ ابتداء بڑی نہ تھی۔ اس نے اسلحہ سے بندوقیں نکال کر ان میں تقسیم کیں اور انہیں محلے سے باہر ایک کھلے میدان میں نشانہ بازی کے لیے لے گیا۔ دوسرے دن پندرہ آدمی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ایک ہفتہ کے بعد معظم علی سے فوجی تربیت حاصل کرنے والے رضا کاروں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی۔

اس کے اپنے دو نوکر صابر اور جمال خاں بھی رضا کاروں میں شامل ہو چکے تھے جمال خاں چند برس بنگال کی فوج میں ملازمت کر چکا تھا۔ لیکن صابر کو تھوڑا اور بندوق سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف جمال خاں کی رقابت کی وجہ سے رضا کاروں کی پیر میں شامل ہوتا تھا تین دن اپنے ساتھیوں کے قہقہے سننے کے بعد ایک روز محض اتفاق سے اس کا پہلا نشانہ بہت پر لگا اور وہ بندوق وہیں پھینک کر بھاگتا ہوا معظم کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں پلایا:

سرکار میرا نشانہ ٹھیک ہو گیا ہے اب مجھے چھٹی دیجیے، گھر میں بہت کام ہے۔
معظم علی کی یہ ہم اب آہستہ آہستہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ کچھ لوگ اپنی مرضی سے اور کچھ مجبوراً اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ہر روز تین چار گئے رضا کاروں کو تربیت دینے کے بعد حسین بیگ کے محل میں چلا جاتا۔ جمال حسین بیگ نے اس کی ہدایات کے مطابق چالیس مزدور پرانی دیواریں مرمت کرنے اور مختلف مقامات پر مورچے بنانے کا کام پر لگانے کا ارادہ کیا۔ معظم علی ان کا کام دیکھتا۔ محل کے مختلف گوشوں میں چکر لگاتا اور اگر کوئی نئی بات ذہن میں آتی تو انہیں ہدایات دے کر چلا آتا۔ پھر وہ محلے کی گلیوں میں پھرتا اور خاص خاص مقامات

جوان کے ساتھ چلے ہیں۔ انہیں یہ بھی بتا چکے ہوں گے کہ مرشد آباد پر حملہ کرنے سے کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ محاذ جنگ سے ہماری فوج کی توجہ ہٹانے کے لیے چند دسے اس طرف بھیج سکتے ہیں۔ آپ میرے مصیب کو جانتے ہیں وہ ایک ہوشیار آدمی ہے۔ اور مرشد آباد کے چتر چتر سے واقف ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اب تک مرشد آباد پر قبضہ کر چکا ہوتا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ جگت سیٹھ نے اپنے محل کی حفاظت کے لیے ڈیڑھ سو آدمی بھرتی کیے ہیں اور ہمارے استاد شیر علی کو بھی ملازم رکھ لیا ہے۔ آج صبح جب میں محاذ جنگ کی خبریں معلوم کرنے کے لیے شاہی محل کے داروغہ کے پاس جا رہا تھا تو راستے میں شیر علی خاں ملے اور انھوں نے اصرار کیا کہ میں بھی جگت سیٹھ کی ملازمت کر لوں۔ لیکن نے جواب دیا کہ میں ایک کروڑ پتی مہاجن کے خزانوں کی حفاظت کرنے کی بجائے اپنے محلے کے کسی غریب آدمی کے دروازے پر پرہہ دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ چچا جان ہو سکتا ہے کہ میرے خدشات محض دہم ثابت ہوں۔ لیکن جب تک جنگ ختم نہیں ہوتی اور ہماری فوج واپس نہیں آتی میں اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا۔ اب اگر اجازت ہو تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے محل کی دفاعی حالت کیسی ہے اور اسے بہتر بنانے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔

”بہت اچھا تم اپنا کام کرو، میں محلے کے آدمیوں کو دعوت بھیجتا ہوں۔ یہ کہہ کر حسین بیگ اپنے نوکروں کی طرف متوجہ ہوا۔“ تم سب ابھی طرح سن لو کہ آج سے معظم علی تمہارا داکر ہو گا اور اسے کسی شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔“



شام کے وقت حسین بیگ کے دسترخوان پر محلے کے تیس چیدہ چیدہ آدمی جمع تھے۔ پہلے حسین بیگ نے انہیں جمع کرنے کی غرض و نایت بیان کی اور اس کے بعد معظم علی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہاجن کی اکثریت یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ مرشد آباد کو کوئی خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ وہ محض استیلا کے طور پر اپنے اپنے زیر اثر لوگوں کو معظم کرنے کے لیے تیار تھے۔

پر مورچے تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا چند دنوں میں محلے کی مرگی کے ناکے پر پھانک لگ چکے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی اس کام میں دلچسپی لینے لگے جو چند دن پہلے اپنے گھروں میں بیٹھ کر اس کا مذاق اڑاتا کرتے تھے۔ عشا کی نماز کے بعد قریباً ہر روز اس کے چند چیدہ چیدہ ساتھی حسین بیگ کے مکان پر جمع ہو کر دن بھر کی کارگزاری کا جائزہ دیتے اور اگلے دن کے لیے پروگرام بناتے۔



ایک دن مرزا حسین بیگ کی دعوت پر شیر علی نے اس کی حویلی کے دفائی انتظامات کا معائنہ کیا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا نالی پرانیوں کے ستون تعمیر ہو رہے ہیں۔ اس کے استفسار پر معظم علی نے بتایا کہ فصیل کی چوڑی نہیں جب ان ستونوں پر لکڑی کے تختے ڈال دیئے جائیں گے تو سپاہیوں کے لیے جگہ نکل آئے گی۔ فصیل کا کنارہ ذرا اونچا ہوگا۔ اور یہ سپاہیوں کے لیے ڈھال کا کام دے گا باقی تین طرف یہ کام ختم ہو چکا ہے۔ چلیے آپ کو دکھاتا ہوں۔

شیر علی نے بیرونی احاطے میں فصیل کا چکر لگانے کے بعد حسین بیگ سے کہا: "مرزا صاحب آپ نے تو اس مکان کو قلعہ بنا دیا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "ڈیوڑھی کی چھت پر بھی مہار مورچہ کافی مضبوط ہے لیکن یہ سب عارضی انتظامات ہیں۔ اگر وقت ہوتا تو میں مرزا صاحب کو یہ چار دیواری لگا کر فیصل تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا۔ چلیے آپ کو اندر دلی حصہ دکھاتا ہوں۔"

شیر علی ان کے ساتھ اندرونی احاطے میں داخل ہوا۔ معظم علی نے اسے رہائشی مکان کی نچلی منزل کی کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ریت کی دیواروں کے مورچے دکھانے کے بعد کہا: "آپ اسی قسم کے انتظامات بالائی منزل میں بھی دیکھیں گے۔ میں نے چھتوں پر بھی مورچے بنوا دیئے ہیں اگر دشمن اندرونی احاطے تک پہنچ گیا تو اسے ہر کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے علاوہ چھتوں اور بالکونوں کے مورچوں سے گولیوں کی بارش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم

میں ان انتظامات کو کافی نہیں سمجھتا۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ اندرونی احاطے کی دیواریں بہت کمزور ہیں۔ اور ان کی بلندی بھی زیادہ نہیں۔ دشمن بیرونی احاطے میں داخل ہونے کے بعد انھیں آسانی سے پھانڈ کر اندر آ سکتا ہے ان کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ انھیں اونچا بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے میرا ارادہ ہے کہ اس کے آگے ایک خندق کھود دی جائے اور اسے پانی سے بھر دیا جائے۔ اس کے بعد اگر وقت ملا اور مرزا صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا تو خندق کے ساتھ بانس گاڑ دیئے جائیں گے، جو قریباً ایک گز زمین کے اندر اور کوئی اٹھالی گز زمین کے باہر ہوں گے۔ بانس کی یہ بانٹ زیادہ مضبوط نہیں ہو سکتی لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ دشمن دیوار پھانڈنے اور خندق عبور کرنے کے بعد براہ راست رہائشی مکان میں مہارے آخری مورچوں پر حملہ نہیں کر سکے گا۔ مکان کے مورچوں سے ہماری گولیاں خندق میں گرنے والوں کو مڑاٹھانے کا موقع نہیں دیں گی۔ مرزا صاحب کے پاس دو توپیں ہیں اور انھیں دروازے کے سامنے نصب کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس طرف صحن میں ایک کھائی کھودی جائے گی جس میں پچاس ساٹھ سپاہی چھپ کر بیٹھ سکیں گے۔ اگر دشمن نے دروازہ توڑ کر اندر آنے کی کوشش کی تو اسے سب سے پہلے ہماری توپوں کی آتش بازی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر بھی یہ تمام انتظامات عارضی ہیں اور ایک غیر متوقع حملے کے پیش نظر کیے گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ مرچے بیرونی فصیل توڑنے یا پھانڈنے کے بعد کسی منظم فوج کی بجائے ایک میلے کی بھیڑ کی شکل میں اندرونی احاطے میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ اور ان کا نصب ایکن صرف لوٹ مار ہوگا۔ اگر ہم نے ایک بار ان کے دانت کٹے کر دیئے تو وہ دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔"

شیر علی نے کہا: "لیکن برخوردار! اتنے بڑے کام کے لیے ایک طویل عرصہ چاہیے۔ تمہارے خیال میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں کتنا وقت لگے گا؟"

"اگر پچاس ساٹھ آدمی روز کا کم پانچ گادینے جائیں تو یہ تمام چند دن میں ختم ہو سکتا ہے لیکن

میں نے جو کچھ کیا ہے وہ معظم علی کی اس کا گزاری کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ معظم علی نے اس محلے کے لوگوں میں جو مدافعتیہ ہندو سید کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ لیکن جگت سیٹھ نے جو کرائے کے سپاہی بھرتی کیے ہیں ان میں سے بعض کے متعلق تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ خطرے کے وقت وہ شاید اپنی ہندوؤں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں۔

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ، ہاشی مکان کی دوسری طرف بندوق چلنے کی آواز سنانی دی۔ شیر علی نے چونک کر کہا: "یہ بندوق کی آواز شاید اندر سے آئی ہے۔"

حسین بیگ مسکرایا: "یہ افضل کی بہن ہوگی۔ وہ بالائی منزل کے درجے سے بندوق چلانے کی مشق کیا کرتی ہے۔"

تھوڑی دیر اور باتیں کرنے کے بعد شیر علی نے حسین بیگ سے رخصت چاہی۔ معظم علی اسے ڈیوڑھی تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ دروازے پر پہنچ کر شیر علی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "معظم آج جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کے بعد مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کئی سال فوج میں ملازمت کرنے کے بعد بھی تمہارے مقابلہ میں میری معلومات بہت کم ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی دن تھوڑی دیر کے لیے جگت سیٹھ کے محل میں اگر میرے انتظامات کا جائزہ لو۔ یقیناً تم مجھے کوئی کارآمد مشورے دے سکو گے؟"

"آپ جس وقت دم دیں، میں حاضر ہوں۔"

"اگر فرصت ملے تو آج ہی کسی وقت آجاؤ!"

"بہت اچھا، میں آج ظہر کی نماز کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔"

چند دن بعد حسین بیگ کے محل کے بیڑی ادا ملے اور فیصل کے دفاعی انتظامات مکمل ہو گئے تو معظم علی نے اندرونی پار دیواری کے ساتھ خندق کھودنے کو کہا۔

حسین بیگ نے جواب دیا: "جو کچھ ہم کر چکے ہیں کافی ہے۔ ہمیں اس گھر کا علیہ اس قدر

پرستی سے مرزا صاحب کو میری بہت سی تجاویز سے اتفاق نہیں۔"

حسین بیگ نے شیر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے منظر کسی تجویز سے اختلاف نہیں لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت دقت پائیے۔ اور پھر اگر ہمارا یہ دم غلط ثابت ہوا، کہ مرہٹوں کی فوج ہماذ جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکے گی تو شہر کے لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔ اور وہ تو چھوڑتے میرے اپنے بیٹے واپس آکر یہ کہیں گے کہ اباجان آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ اب بھی یہ حالت ہے کہ مرشد آباد میں میرے بعض دوست میری دفاعی حالت پر شہر کرتے ہیں۔"

شیر علی نے کہا: "مرزا صاحب! لوگوں کی نکتہ چینی کی پروا نہ کیجیے۔ خدا کرے کہ مرشد آباد کے متعلق ہمارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوں لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ مرہٹے اگر میدان جنگ سے شکست کھا کر واپس بھی چلے گئے تو ہمیں مستقبل میں کوئی اور خطرہ پیش نہیں آسکتا۔ موجودہ دور میں ہمیں ہر وقت غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے تیار رہنا چاہیے۔ عقلمند لوگ ہمیشہ بارش سے پہلے اپنے مکانوں کی چھتیں مرمت کرتے ہیں اور موجودہ زمانے میں بارش سے زیادہ دشمن کے حملے کے متعلق سوچنا پڑتا ہے۔ بعض گھٹائیں برسات کے موسم میں بھی برے بغیر گزر جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ جو لوگ بارش کے آثار دیکھتے ہی اپنی چھتوں اور پرناؤں کی مرمت کا کام شروع کر دیتے ہیں وہ جیتے ہیں۔"

حسین بیگ نے کہا: "مجھے میں میرے متعلق یہ بات بھی مشہور ہو چکی ہے کہ میرے پاس براخیزانہ ہے اور میں یہ سب کچھ اس کی حفاظت کے لیے کر رہا ہوں۔"

شیر علی نے کہا: "مرزا صاحب آپ اپنا کام جاری رکھیے۔ اگر آپ کے پاس خزانہ نہیں تو شاید کسی دن خزانوں والے یہاں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔ جگت سیٹھ اپنے خزانے کی حفاظت کے لیے بہت فخر مند ہے۔ اب تک وہ اپنے محل کو دفاعی لحاظ مضبوط بنانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کر چکا ہے۔ مجھے اس نے اپنے محل کا محافظ مقرر کیا ہے لیکن اب

نہیں بگاڑنا چاہیے کہ سارا مکان گرا کر از سر نو تعمیر کرنا پڑے۔
 "بہت اچھا چچا جان! جیسے آپ کی مرضی۔ اتنی تیاری سے کم از کم یہ نائدہ ضرور ہوگا
 کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم دشمن کو چند گھنٹوں کے لیے روک سکیں گے۔"
 معظّم علی یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا لیکن حسین بیگ کے کانوں میں اس کے الفاظ دیر تک
 گونجنے رہے وہ سارا دن بے چین رہا اور رات کے وقت بھی اسے اچھی طرح نیند نہ آئی۔
 اگلے دن علی الصباح معظّم علی اپنے گھر میں گہری نیند سو رہا تھا کہ صابرنے اسے بھنبھوڑ کر
 جگایا اور کہا: "سرکار! مرزا صاحب باہر کھڑے ہیں۔"

- مرزا حسین بیگ: "معظّم علی نے حیران ہو کر کہا۔"

- ہاں سرکار۔ شاید وہ کہیں جا رہے ہیں۔"

معظّم علی جلدی سے اٹھا اور بھاگتا ہوا باہر نکلا۔

- آپ! اس وقت؟ اس نے حسین بیگ کو دیکھتے ہی کہا۔

"دیکھو بیٹا! حسین بیگ نے کسی تمہید کے بغیر کہا: کل تم سے باتیں کرنے کے بعد میں
 نے یہ سوچا کہ جب اتنا کچھ کیا ہے تو خندق بھی کھود دی جائے۔ لیکن وہ بس اتنی گہری ہو کر دشمن
 اندرون دیوار پہنچانے کے بعد آسانی سے مکان پر حملہ کر سکے۔ لیکن تم یہ وعدہ کرو کہ اس کے
 بعد خندق کے آگے بانس گاڑنے کی تجویز پر زور نہیں دو گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ مرزا کا پاد کے
 لوگ مجھے سچ پچ پاگل سمجھنے لگ جائیں۔"

معظّم علی جانتا تھا کہ ایک کام ختم ہونے کے بعد وہ خود بخود دوسرا کام شروع کر دیا
 گے۔ تاہم اس نے کہا: "چچا جان میں تو خندق کے لیے بھی آپ کو مجبور نہیں کرتا۔"

- نہیں نہیں خندق ضرور کھودی جائے گی۔ میں اس کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ لوگ بھوکتے
 رہیں مجھے ان کی پروا نہیں۔"

"بہت اچھا چچا جان۔ لیکن آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں دیہات سے آدی بلانے کے لیے جا رہا ہوں۔ یہ شہر کے لوگ بیکار ہیں۔ یہ کام کرنے
 کی بجائے میرا مذاق اڑائیں گے۔ دوپہر تک میرے علاقے کے ڈیڑھ دو سوکان یہاں پہنچ جائیں
 گے۔ اس کے بعد اگر زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی تو دیا پار کی جاگیر کے کسانوں کو بھی بلواؤں
 گا لیکن یہ کام چار دن کے اندر ختم ہو جانا چاہیے۔" حسین بیگ نے یہ کہہ کر گھوڑے کو
 ایڑ لگا دی۔

تیسرے پہر حسین بیگ کے مکان میں خندق کی کھدائی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اور
 اس کے نگر خانے میں کوئی دو سو آدمیوں کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔

اگلے دن حسین بیگ کا ایک دوست اس کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: مرزا
 صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟

مرزا صاحب سے پہلے بھی کئی آدمی یہ سوال کر چکے تھے۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔
 "دیکھیے صاحب یہ میرا اپنا مکان ہے۔ اگر میں اسے کھود کر ایک تالاب بنوا دوں تو مجھے
 آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں۔"

دوست نے دوبارہ اس موضوع پر زبان کھولنے کی ضرورت محسوس نہ کی جب وہ چلا
 گیا تو حسین بیگ نے ایک نوکر سے کہا:

"دیکھو آئندہ جو لوگ مجھ سے ملنے آئیں انہیں لانے کی بجائے باہر کی بیٹھک میں
 روک لیا کرو۔"

چند دن بعد خندق تیار ہو گئی اور حسین بیگ نے حویلی سے بڑی کپاہی خارج کرنے والی
 نالیوں کا رخ اس طرف پھیر دیا۔ اس کے بعد اگلے دن محلے کے لوگوں نے دیکھا کہ حسین بیگ
 کی حویلی میں بانسوں سے لدے چھکڑے چلے آ رہے ہیں وہ حیران تھے۔ لیکن کسی کو حسین بیگ
 کے سامنے اپنی حیرانی کے اظہار کی جرأت نہ ہوئی۔

اس دوران میں معظّم علی بلاناغہ محلے کے رضا کاروں کو تربیت دیتا رہا۔ بیت اب ترائی

جوش و خروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا اور رضا کا دل کی تعداد بڑھنے کی بجائے روز بروز کم ہو رہی تھی تاہم اسے اس بات سے اطمینان تھا کہ وہ محلے کے اکثر لوگوں کو بندھن چلانا سکنا چکا ہے۔ اب وہ لوگ بھی جو بظاہر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ درپردہ اپنے اپنے گھروں کی حفاظت کے انتظام کر رہے تھے۔ معظم علی کی تحریک کے اثرات مرشد آباد کے دوسرے محلوں میں بھی پہنچ چکے تھے اور جو انوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شہریوں میں ماضی نہ شعور پیدا کرنے کے لیے میدان میں آچکی تھی۔



ایک دن معظم علی نے محلے کے تمام رضا کا دل کو حسین بیگ کے مکان میں جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ بھائیو! اور بزرگو! چند ہفتے قبل مرشد آباد سے فوج کی روانگی کے بعد میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اگر خدا خواستہ مرشد آباد کو کوئی خطرہ پیش آیا تو شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے ہمارا عند انتہائی غیر محفوظ ہوگا۔ لیکن آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاہی محل کے بعد ہمارا محاذ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ اب اگر کسی نے ہم پر حملہ کیا تو وہ ہمیں بیٹروں کی طرح نہیں ہانک سکے گا۔ پہلے تو ہم دشمن کو گلیوں کے دروازوں سے باہر روکیں گے پھر اگر وہ ہمارے ابتدائی مورچے توڑ کر اندر گھس آیا تو ہم اپنے مکانات کی چھتوں اور دیواروں سے گولیاں برسائیں گے۔ اس کے بعد اگر ہمیں اور کچھ بٹنا پڑا تو یہ جوبی ہمارے لیے آخری حصار ثابت ہوگی۔ خطرے کے وقت محلے کی عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو یہاں پناہ مل سکے گی اور ہم اپنے مورچوں میں بیٹھ کر ان کی حفاظت کر سکیں گے۔ آپ اس جوبی کے اندر اور باہر اپنا اپنا مورچہ دیکھ چکے ہیں۔ اب وہ لائحہ عمل سن لیں جس کے مطابق ہمیں کام کرنا ہوگا۔ خطرے کے وقت سب سے پہلے محلے کے اندر اور باہر مختلف مقامات پر پہرہ دینے والے رضا کا دل نقارے بجائیں گے۔ اس وقت آپ کو چاہیے کہ آپ ایک لمحوں کے بغیر اپنے اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو ابھی سے یہ سمجھا دیں کہ وہ کسی بدتراسی کا مظاہرہ نہ کریں اور نقارے کی

آواز سننے ہی اس جوبی کے رہائشی مکان میں جمع ہو جائیں۔ یہاں اتنی جگہ ہے کہ محلے کی تمام عورتیں اور بچے سما سکیں۔ نقارے کی آواز کے سنوڑی دیر بعد جوبی کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ آج دوپہر کے بعد ہم اس کی مشق بھی کریں گے۔

شام سے قبل کسی وقت نقارے بجائے جائیں گے اور ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی غیر متوقع صورت حالات کا سامنا کرنے کے لیے ہم کس حد تک تیار ہیں۔ دن کے وقت عورتیں اور بچے اپنی اپنی جگہ پناہ دیکھ لیں گے۔ اور اس کے بعد رات کو کسی وقت یہ مشق دوبارہ کی جائے گی۔ ایک مقررہ سیدہ آدمی نے اٹھ کر سوال کیا۔ آپ کا مطلب ہے کہ رات کے وقت بھی ہمارے بال بچوں کو اٹھ کر اس طرف بھاگنا پڑے گا؟

معظم علی نے جواب دیا۔ ہاں لیکن رات کے اندھیرے میں وہ بھاگ نہیں سکیں گے انھیں تاریک گلیوں سے گزر کر یہاں پہنچنا ہوگا۔ جوبی کے اندر صرف چند منٹ کے لیے مشطیں جلائی جائیں گی تاکہ وہ اپنی اپنی جگہ پناہ دیکھ سکیں۔

ایک اور آدمی نے اٹھ کر کہا۔ لیکن یہ تو عجیب بات ہوگی۔ عورتیں اور بچے رات کے وقت یہاں کیے پسینے گئے؟

تو میرا بولا۔ ہم آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن رات کے وقت عورتوں اور بچوں کا یہ تا شا ٹھیک نہیں ہوگا۔

معظم علی نے جواب دیا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ دشمن صرف دن کے وقت حملہ کرے گا تو میں اپنی ماؤں اور بہنوں کو یہ تکلیف دینا ناگوار نہ کرتا۔ لیکن موجودہ حالات میں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ رات کے وقت اگر موسلا دھار بارش جو رہی ہو تو بھی ہمیں یہ مشق ضرور کرنی چاہیے ہیں جانتا ہوں کہ بعض کوتاہ اندیش لوگ روز آدل سے ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ چند برس میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہر کئی بار لٹ چکے ہیں اور عاقبت پسند لوگوں نے وہ مصائب اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ آتے تھے۔

ہیں۔ اگر مجھے وہ اختیارات ہوتے جو فوج کے ایک افسر کو اپنے ماتحت سپاہی پر ہوتے تو میں
تھیں بدترین سزا دیتا۔

دوسرے رضا کار نے کہا: لیکن جناب اب تو کوئی بھی اپنے مورچے پر نہیں بیگیوں کے
تمام پر پیر ڈیوڑھی سے باہر کھڑے ہیں۔

معظم علی لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ چند بچے اور عورتیں جن کے لیے اندر
یا باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا ڈیوڑھی کی دیواروں کے ساتھ محسوس ہوئی تھیں۔ باہر اشراف
کے گرد لوگوں کا جھوم تھا اور وہ ان کے سامنے جنگ کی ایسی تفصیلات بیان کر رہا تھا جن
کا واقعات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ شاہی محل کے ایک سپاہی نے صرف یہ سنا تھا کہ مرہٹے
پسا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگوں کو یہ بتا رہا تھا کہ بنگال کی افواج میدان میں دشمن کی لاشوں کے
ڈھیر لگانے کے بعد سرحد کے پار ان کا تعاقب کر رہی ہیں۔

چند عورتیں یہاں بھی جھوم کے درمیان پھنسی ہوئی تھیں اور بچے بلبلا رہے تھے۔ معظم علی
نے لوگوں کو ملامت کی اور وہ ایک طرف ہٹ گئے۔

اشراف خاں، معظم علی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اس نے کہا: جناب آپ فتح کی
خبر سن چکے ہیں؟

”میں سن چکا ہوں۔ اور اب میں آپ لوگوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ یہاں سے ہٹ
جائیے چند خواتین ڈیوڑھی کے اندر پھنسی ہوئی ہیں۔“

معظم علی یہ کہہ کر واپس ہٹا اور اس نے حسین بیگ کے ایک نوکر کو ابھی تک ڈیوڑھی کی
چھت پر اپنے مورچے میں بیٹھا ہوا تھا۔ تقاریر بیانے کے لیے کہا۔ ایک مہر سیدہ آدمی نے ہنسنے ہوئے
کہا: اب تقاریر بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو یوں بھی سب لوگ جھپٹی کر چکے ہیں۔

معظم علی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندرونی صحن
کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے عورتوں اور بچوں کا جھوم تھا۔ معظم علی

مرہٹے بھاگ گئے۔ کے نعروں میں دب کر رہ گئی۔

اس نے ایک رضا کار کو گردن سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: تمہیں فیصل سے اترنے کی
اجازت کس نے دی۔ جاؤ اپنے مورچے میں؟

نوجوان مرعوب سا ہو کر دوبارہ لکڑی کی میٹھی سے فیصل پر چڑھ گیا۔ دوسرے رضا کار
تذبذب کی حالت میں کھڑے تھے۔ معظم علی غضب ناک ہو کر چلا: ”تم کیا دیکھ رہے ہو۔
جاؤ اپنے مورچوں میں؟“

وہ بادل ناخواستہ دوبارہ اپنے مورچوں میں چلے گئے۔ لیکن ان کے آگے باقی ساری فیصل
کے مورچے خالی ہو چکے تھے اور دروازے کی سمت لوگوں کے نعرے برائے بلند ہو رہے تھے۔
معظم علی بھاگتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے لوگوں کا جھوم تھا۔ معظم علی کو دیکھ
کر ایک رضا کار نے بلند آواز میں کہا: ہماری فوج کو فتح ہوئی ہے۔ مرہٹے اب اس طرف نہیں
آئیں گے۔ اب آپ کو اس محلے کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔

معظم علی نے کہا: اگر فتح کی خبر سننے کے بعد تمہاری افوازی کی یہ حالت ہے تو مجھے
اب زیادہ فخر مند ہونا چاہیے۔ فتح کی خبر کون لایا ہے؟

رضا کار نے جواب دیا: ”اشراف خاں شاہی محل سے یہ اطلاع لے کر آیا تھا۔ ہم گلی
کا دروازہ بند کر چکے تھے اور پہنچے۔“

”اور تمہارے دروازہ کھول دیا؟“

”ہاں۔“

”لیکن میری ہدایت تھی کہ جب تک دوسرا تقاریر نہ بھایا جائے۔ بیگیوں کے دروازے
نہ کھولے جائیں۔“

”لیکن وہ فتح کی خبر لے کر آیا تھا۔“

معظم علی نے کہا: ”ترہیبیہ امن کبھی کبھی بڑی سے بڑی فتح کو شکست میں بدل دیتے

انہیں دیکھ کر ٹوٹ آیا اور دروازے کے پاس ہی چھپر کے نیچے پڑی ہوئی ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حسین بیگ کا ایک نوکر باہر نکلا اور معظّم علی نے اس سے پوچھا: "مرزا صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ اس وقت کتب خانے میں ہیں۔"

"اچھا اب تم خواتین سے کو کران کے لیے راستہ خانی جو پکا ہے۔"

"بہت اچھا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو بند قیں اسلحہ خانے سے تقسیم کی گئی تھیں"

ان کے متعلق کیا ہدایت ہے؟"

معظّم علی نے کہا: "ابھی انہیں رضا کاروں کے پاس رہنے دو؟"



تھوڑی دیر بعد محلے کے ہر گھر میں مرزا حسین بیگ کے متعلق اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"مرزا حسین بیگ کو کسی بخوی نے بنایا تھا کہ مرے محلے پر حملہ کریں گے۔"

"اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو اس کے گھر میں گھس گئے ہیں۔" حسین بیگ ایک سیدھا سادہ

آدمی ہے۔ اور خود علی کے لڑکے نے اسے بوقت بنایا ہے۔"

رات کے وقت فتح کی خوشی میں محلے کی ہر گلی میں چراغ جلانے جا رہے تھے۔ جلگت سیٹھ

کے محل میں آتش بازی چلائی جا رہی تھی۔ حسین بیگ کے محل میں بھی چراغاں ہو رہا تھا۔ بازار

اور گلیوں میں چل پھل تھی۔ معظّم علی عشاء کی نماز کے بعد اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا گذشتہ چند

دن کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ جمال خاں نیچے صحن میں اپنی کھاٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک

معظّم علی کو گلی میں شور مچا دیا اور اس نے اوپر سے آواز دیا:

"صابر! صابر!"

جمال خاں نے جواب دیا: "جی صابر ابھی باہر گیا ہے۔"

معظّم علی نے کہا: "اچھا تم جا کر دیکھو باہر کیا ہو رہا ہے؟"

جمال خاں بھاگ کر باہر نکلا۔ لیکن چند منٹ تک وہ واپس نہ آیا تو معظّم علی نیچے اتر آیا جب وہ باہر نکلا تو جمال خاں اور صابر واپس آتے دکھائی دیے۔

معظّم علی نے کہا: "بہت دیر لگائی تم نے کیا بات تھی؟"

جمال خاں نے جواب دیا: "جی کچھ نہیں محلے کے چند لڑکے صابر کے ساتھ لڑ رہے تھے،

میں پہنچا تو وہ بھاگ گئے۔"

"کیا بات تھی صابر؟"

صابر نے جواب دیا: "جی وہ آپ کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انہوں نے مرزا صاحب کے

متعلق بھی بہت داہیات باتیں کیں۔ وہ کہتے تھے کہ آپ نے لوگوں کو بوقت بنایا تھا اور مرزا

صاحب کے ساتھ کسی بخوی نے مذاق کیا تھا۔ ان باتوں پر مجھے غصہ آ گیا۔"

"میں جانتا ہوں جو کچھ انہوں نے کہا ہوگا۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"جی نہیں ذرا کسیر پھوٹ گئی ہے۔ لیکن میں نے دو لڑکوں کو خوب پیٹا ہے۔"

"بہت بُرا کیا تم نے۔ بڑوں کو بچوں کے ساتھ نہیں لڑنا چاہیے!"

"جناب وہ بچے کہاں تھے، ایک تو مجھ سے بھی آدھ ہالشت اونچا تھا۔"

"اچھا اب آرام کرو اور آئندہ اگر کوئی مجھے کچھ کہے تو تمہیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔"

تیسرا باب

اگلے دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ معظم علی صبح کا ناشتہ کھا کر ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ دس بجے کے قریب حسین بیگ کا نوکر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ زلیخا صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں۔

معظم علی مل میں پہنچا، حسین بیگ دیوان خانے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے معظم علی کو دیکھتے ہی کہا: "آؤ بیٹا میں ابھی شاہی محل کے ناظم اور مرشد آباد کے فوجدار سے مل کر آیا ہوں۔ فوج کی خبر درست ہے۔ ہماری افواج نے کٹھن پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ مرہٹوں نے شہر خالی کرنے سے پہلے کٹھن اور اس پاس کی بستیوں میں خوراک کے تمام ذخیرے تباہ کر دیئے تھے۔ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور فوج کا سامان رسد بھی ختم ہو چکا ہے۔ آج مرشد آباد سے الحاج بھیجا جا رہا ہے۔ مرہٹے بھاری نقصان اٹھانے کے بعد کٹھن سے چند میل پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ لیکن ابھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واپس چلے جائیں گے یا کوئی اور محاذ تلاش کریں گے۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ مرشد آباد کو اب کوئی خطرہ نہیں۔ تمہیں محلے کے طرز عمل سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ لوگ بجتے رہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ فوج کے واپس آجانے پر بھی اپنی جوتی کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کا کام جاری رکھیں گا۔ برسات کے بعد بیرونی فصیل کی مرمت کی جائے گی اور اندرونی دیوار کو گرا کر اس پر تیسرے تہا کی جائے گا۔ اور یہ سارا کام تمہاری مرضی کے مطابق

ہوگا۔"

معظم علی نے کہا: "چچا جان میں لوگوں کے طرز عمل سے پریشان نہیں ہوں اور میرے نزدیک مرشد آباد کا خطرو کم نہیں ہوا۔ کٹھن سے فرار ہونے کے بعد مرہٹے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ بیگال کا کون شہر ایسا ہے جس پر وہ آسانی سے قبضہ کر سکتے ہیں اور جہاں سے انہیں زیادہ سے زیادہ مال غنیمت مل سکتا ہے۔ اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب ان کا ہدف مینڈا پوریا لنگ ہوگا۔ یا وہ مرشد آباد کا رخ کریں گے۔ ان کے لیے مرشد آباد پہنچنا نسبتاً مشکل ہوگا۔ لیکن اگر انہوں نے مرشد آباد کی دولت کا دوسرے شہروں سے مقابلہ کیا تو وہ شکلات کی پروا نہیں کریں گے۔"

حسین بیگ نے کہا: "مرشد آباد کی دفاعی حالت اتنی کمزور نہیں۔ فوج اگرچہ یہاں کافی نہیں لیکن اتنی کم بھی نہیں کہ بیرونی حملہ آور کو ایک دو دن بھی روک نہ سکے۔ پھر لی دردی خاں اتنا نادان نہیں کہ وہ مرشد آباد کو خطرے میں دیکھ کر کٹھن میں بیٹھا رہے۔ اگر مرہٹوں نے اس طرف کا رخ کیا تو علی دردی خاں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں پہنچ جائے گا۔"

معظم علی نے کہا: "اور یہی بات ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ دشمن کو اگر مرشد آباد کا رخ کرنے میں کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ صرف علی دردی خاں کی توجہ دوسرے محاذ پر مبذول کرنے کے لیے چند تہے مرشد آباد کی طرف روانہ کر سکتا ہے۔ دارالحکومت کو خطرے میں دیکھ کر علی دردی خاں ایک لمحہ کے لیے بھی کٹھن میں ٹھہرنا گوارا نہیں کریں گے۔ بیشک ان کے یہاں پہنچ جانے سے مرہٹوں کا بھاگ جانا یقینی ہے۔ لیکن مرہٹوں کی باقی فوج کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر مینڈا پور پر قبضہ کر لے گی اور اس کے بعد برودان کا سارا علاقہ خطرے میں پڑ جائے گا۔"

حسین بیگ نے دل برداشتہ ہو کر کہا: "تو پھر علی دردی خاں کو کیا کرنا چاہیے؟ تمہارا خیال ہے کہ اگر مرہٹوں کا کوئی لشکر مرشد آباد پہنچ جائے تو اسے ان کا پیچھا نہیں کرنا چاہیے؟"

"نہیں چچا جان۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ علی دردی خاں کے سالاروں نے اسے صحیح مشورہ

دیا تو اس فتح کے بعد مرہٹوں کو کسی اور محاذ کا رخ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ میرے خیال میں یہی چند دن ایسے ہیں جب مرہٹوں پر ضرب کاری لگانی جاسکتی ہے۔

حسین بیگ نے کہا: اچھا بتاؤ اگر تم علی وردی خان کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

مظلم علی مسکرایا اور اس نے قدرے توقف کے بعد کہا: میں اگر ان کی جگہ ہوتا تو اس فتح کے بعد ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان کا تعاقب جاری رکھتا۔ میں کٹوے میں پڑاؤ ڈال کر مرہٹوں کا اور دوسرے شہروں سے سامان رسد کا انتظار کرنے کی بجائے اپنے بھوکے سپاہیوں سے کہتا کہ ہمارے پاس رسد کی کمی ہے۔ لیکن ہم مرہٹوں سے اناج کے وہ ذخیرے چھین سکتے ہیں جو انھوں نے اس علاقے کو لوٹ کر جمع کیے ہیں۔ اس صورت میں مرہٹوں کے سامنے صرف اپنی جانیں بچانے کا مسد ہوتا۔ مرہٹے کسی مظلم فوج کے سپاہی نہیں صرف لیڑے ہیں۔ ان کی گد تائید بتاتی ہے کہ وہ ایک محاذ سے نقصان اٹھانے کے بعد جوابی حملہ کے لیے ہمیشہ کوئی تیار تلاش کرتے ہیں۔ اور اگر ان کا مقابلہ چوکس ہو تو وہ تیاری کا موقع حاصل کرنے کے لیے صلح کی بات چیت شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ان پر غیار کا وقت ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت کٹوے میں فتح کا جشن منایا جا رہا ہو گا۔ انعامات اور فطیحتیں تقسیم ہو رہی ہوں گی۔ اور مرہٹے چند میل دور اپنے پڑاؤ میں کسی نئے محاذ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ پھر رسد کا سامان پہنچے گا۔ سپاہی اور انسر چند دن خوشیاں منائیں گے۔ پھر جنگ کی تیاری ہوگی اور یہی ہو گا کہ پندت بھاسکر نے صلح کی بات چیت شروع کر دی ہو اور جس دن یہ بات چیت ختم ہو۔ علی وردی خان کو یہ اطلاع ملے کہ مرہٹوں کی فوج کا ایک حصہ کٹوے سے پچاس یا سو کوس دور ہمارے کسی اور علاقے یا شہر میں لوٹ مار شروع کر چکا ہے۔ مجھے علی وردی خان کی سپاہیانہ صلاحیتوں کا اعتداف ہے۔ لیکن میں ایک حکمران کی سیاسی مصلحتوں سے ڈرتا ہوں۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو آج بنگال کی فوجیں کٹوے سے سو کوس دور مرہٹوں کا تعاقب کر رہی ہوتیں۔ ان کے رسد اور بارود کے محاذ سارا دن کی توہیں ہمارے قبضے میں ہوتیں پندت بھاسکر اگر صلح کے لیے اچھی بھیجتوئیں

یہ جواب دینا کہ صلح کی بات چیت صرف بنگال کی سرحدوں سے باہر ہو سکتی ہے۔

حسین بیگ نے کہا: لیکن میرمن، علی وردی خان کے ساتھ ہے اور تم ہمیشہ یہ کہہ کرتے ہو کہ وہ ایک حقیقت پسند سپاہی ہے!

مظلم علی نے جواب دیا: وہ یقیناً ہماری فوج کے تمام جرنیلوں سے زیادہ دوراندیش ہیں لیکن میدان جنگ سے باہر علی وردی کے نزدیک ایسے لوگوں کی اہمیت عام طور پر کم ہو جاتی ہے۔ دہلی میں وہ میر جعفر اور دلب رام جیسے خوشامدیوں اور جی حضوروں کی باتیں زیادہ غور سے سنتے ہیں۔

حسین بیگ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا: ہاں مظلم آج صبح چند آدمی بندو قیں واپس کرنے آئے تھے۔ لیکن میں نے انھیں یہ کہا کہ جب تک فوج واپس نہیں آئی یہ تمھارے پاس امانت رہیں گی۔ تم بھی یہی چاہتے تھے نا؟

جی ہاں!

لیکن اب تمھارے رضا کار پریڈ کے لیے آنا تو شاید پسند نہ کریں!

پریڈ کی اب ضرورت نہیں وہ ابتلائی نرمیت حاصل کر چکے ہیں۔ اب صرف رات کے وقت محلے میں پرہ دینے کی ضرورت ہے۔ فتح کی خبر سننے کے بعد ایسی باتوں سے لوگوں کی دلچسپی ذرا کم ہو گئی ہے۔ لیکن دو چار دنوں کے بعد وہ پھر سنجیدگی کے ساتھ میری باتیں سننے لگ جائیں گے۔



شام کے وقت بارش ہو رہی تھی۔ مرشد آباد کے قائم مقام فوجدار کے ہاں شہر کے چند روسا اور سرکاری عمدہ داروں کی دعوت تھی۔ جب مہمان ایک کشادہ کمرے میں دسترخوان پر بیٹھ گئے تو کسی نے فوجدار سے مرزا حسین بیگ کی غیر ماضی کی وجہ دریافت کی۔ فوجدار نے جواب دیا: ان کا پیغام آیا ہے کہ ان کی طبیعت خفیک نہیں۔

سے مورچے تعمیر کرنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بھلا بانس گولی روک سکتے ہیں؟
فوجدار نے جواب دیا: بانس گولی نہیں روک سکتے لیکن گولی چلانے والوں کو آگے بڑھنے
سے روک سکتے ہیں۔ میں نے خود مرزا صاحب کی حویلی کے دفاعی انتظامات دیکھے ہیں۔ اور
وہاں مجھے کوئی بات مضحکہ خیز نظر نہیں آتی۔ ان کا محلہ شہر سے باہر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ
خطرے کے وقت اس محلے کے لوگ شہر کے لوگوں کی نسبت کم محفوظ نہیں ہوں گے۔
ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا فوجدار کے قریب پہنچا اور اس نے جبکہ کراس
کے کان میں کچھ کہا۔

فوجدار نے دسترخوان سے اٹھتے ہوئے مہمانوں کی طرف دیکھا اور کہا:

”آپ اطمینان سے کھانا کھائیں، میں ابھی آتا ہوں۔“

فوجدار کمرے سے باہر نکلا تو رات کے ایک فوجی افسر کھڑا تھا۔ اس نے سلام کے
بعد کہا: ”جناب معاف کیجیے میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی ہے لیکن خبر بہت تشریف
ہے۔ مرثیوں کی ایک فوج یلغار کرتی ہوئی مرشد آباد کی طرف بڑھ رہی ہے۔“
فوجدار نے اپنی پریشانی پر قابو پالتے ہوئے کلمہ خیر کون لایا ہے؟

”ابھی راستے کی ایک چوکی کا کمانڈر میاں پہنچا ہے اور وہ یہ کہتا ہے پھیلی چوکیوں کے
سپاہیوں نے ڈاک گھوڑوں پر زبردستی اس تک پہنچائی تھی۔ میں نے تصدیق کے لیے سپاہیوں
کا ایک دستہ روانہ کر دیا ہے۔“

”اور خبر لانے والا کہاں ہے؟“

”جی میں اسے محل کے ناظم کے پاس قیدوار آیا ہوں۔ وہ تھکاوٹ سے تڑھال تھا۔ اس
نے صبح سے لے کر شام تک گاتار سفر کیا ہے اور راستے میں کئی گھوڑے تبدیل کیے ہیں۔ وہ
کہتا ہے کہ جب میں اپنی چوکی سے روانہ ہوا تھا۔ تو میرے صرف ایک منزل پیچھے تھے۔ اور اب
میاں سے شاید دو یا تین منزل دور ہوں گے۔“

ایک شخص نے کہا: ”جناب مرزا صاحب آجکل یوں بھی اپنی حویلی سے باہر نہیں نکلتے۔“
دوسرا بولا: ”بھئی جب گھر میں کام ہو تو باہر نکلتے کی کیا ضرورت ہے۔ مرزا صاحب
آجکل بہت مصروف ہیں۔ آپ ان کی حویلی کے اندر جا کر دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔“
ایک اور آدمی فوجدار سے مخاطب ہو کر بولا: ”جناب اگر آپ مرزا صاحب کو یہ یقین دلاتے
کہ اب مرشد آباد کو کوئی خطرہ نہیں تو وہ ضرور تشریف لاتے!“
فوجدار نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کے مہمان اپنی اپنی بساط کے مطابق مرثیہ میگ
پر بھیتیاں کس رہے تھے۔

شہر کے ایک تاجر نے کہا: میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے محلے کے لوگوں کو رات بھر سونے
نہیں دیتے۔“

مرشد آباد کا کووال بولا: ”مرزا صاحب ایک سیدھے سادے بزرگ ہیں۔ لیکن ان کے
محلے کا ایک فوجانہ ان کے ساتھ دل لگی کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں میں ان کے محلے سے گزر رہا تھا۔
بانس سے بھرے ہوئے کئی چھکڑے ان کی حویلی کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی
سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اندر مورچے بجا رہے ہیں۔“

”بانس کے مورچے؟ ایک امیر زادے نے کہا: آپ کے ساتھ کسی نے مذاق کیا ہوگا؟
”جی نہیں آپ مرزا صاحب کی حویلی دیکھیں تو حیران رہ جائیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد حسین بیگ اس محل کی گشت کا واحد موضوع بن چکا تھا۔ اور قریباً ہر شخص اس گشتگو
میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ فوجدار ایک سنجیدہ آدمی تھا اور اسے یہ باتیں ناگوار محسوس ہو
رہی تھیں وہ کچھ دیر خاموش رہا لیکن جب مہمان زیادہ بے تکلف ہو کر حسین بیگ کا مذاق اڑانے
لگے تو اس نے کہا: ”مرزا صاحب ہمارے بزرگ ہیں اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اس محل میں انھیں
موضوع بحث بنایا جائے۔“

ایک عمر سیدہ آدمی نے کہا: ”جناب مرزا صاحب کا ہم سب احترام کرتے ہیں لیکن ہمنوں

تھوڑی دیر بعد مرشد آباد کے ہر گلی کوچے میں مرہٹوں کی پیش قدمی کی خبر مشہور ہوئی تھی۔ مرزا حسین بیگ کے محلے کی عورتیں بچے بڑے اور جوان موسلا دھار بارش میں اس کی حویلی کا رخ کر رہے تھے۔ ایک ساعت کے اندر اندر رہائشی مکان کی پہلی منزل اور پلانچ کے کمروں اور باموں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بس لوگ افزائشی کے عالم میں بارش سے بچنے کے لیے چار دیواری سے باہر نکلے اور چار دیواری کے گوشوں کی کھڑکیوں اور گھوڑوں کے اٹھل میں پناہ لے رہے تھے۔

مستظم علی محلے کی گلیوں کے ناکے دیکھتے اور سپرہ داروں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد پانی اور کچرے سے تپت حویلی میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی کے اندر دو مشعلیں مل رہی تھیں اور حسین بیگ چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔

مستظم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا: "فوج کی طرف سے کوئی جواب آیا ہے؟"

"ہاں نہ یہ کہتے ہیں کہ صبح سے پہلے مرشد آباد پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں اور اگر کوئی حملہ پیش آیا تو اہل شہر کو خبردار کرنے کے لیے توہیں چلا دی جائیں گی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ مرہٹوں کی قیادت میر حبیب کر رہا ہے۔"

مستظم علی نے کہا: "آپ اندر جا کر آرام کریں۔ میں گلیوں کے تمام ناکے دیکھ آیا ہوں۔ ہمارے انتظامات بہت تسلی بخش ہیں۔"

حسین بیگ نے کہا: "اگر آج رات اس گھر کی چار دیواری کے اندر کوئی آرام کر سکے تو میں یہ کون گا کہ وہ عشر کے دن بھی اطمینان کی نیند سو سکے گا۔ ذرا جا کر دیکھو، تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ انسان اتنا شہرچی سکتے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ روئے زمین کے تمام ہنگامے میرے گھر کی چار دیواری کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے پورے خاندان کو

"اچھا میں ابھی آتا ہوں۔ تم جا کر شہر میں منادی کرا دو!"

افسر نے سلام کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

فوجدار دوبارہ مہمانوں کے کمرے میں داخل ہوا۔

کسی نے سوال کیا: "جناب کیا بات تھی؟"

فوجدار نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے کہا: "کچھ نہیں۔ ایک سرکاری کام تھا۔ آپ اطمینان سے کھانا کھائیں۔"

لیکن جہان کھانے سے زیادہ فوجدار کے چہرے کے آثارِ چڑھاؤ کا مطالعہ کر رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر فوجدار دسترخوان سے اٹھا اور اس نے کہا: "حضرات مجھے کچھ کام ہے۔ میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن آپ آرام سے باتیں کریں۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔"

ایک امیر زادے نے سوال کیا: "آپ اس بارش میں کہاں جا رہے ہیں؟"

فوجدار نے جواب دیا: "ایک سپاہی کو بارش میں چلنے کا عادی بننا پڑا ہے۔ مجھے ابھی خبر ملی ہے کہ مرہٹوں کا لشکر مرشد آباد کا رخ کر رہا ہے۔"

مجلس پر سناٹا چھا گیا اور حاضرین بدحواس ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

فوجدار نے کہا: "لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ ابھی یہاں سے کئی منزل دور ہیں۔ اگر انھوں نے انتہائی کوشش کی تو بھی کل صبح یا دوپہر سے پہلے یہاں نہیں پہنچیں گے۔"

فوجدار باہر نکل گیا۔

چند ثانیے بعد معزز مہمانوں کی افزائشی کا یہ عالم تھا کہ ان کے لیے اپنے جوتے پہنا سنا بھی مشکل تھا۔ کوئی اپنے جوتوں کی بجائے کسی اور کے جوتے پہننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی بدحواسی کی

حالت میں دائیں پاؤں کے جوتے میں بائیں پاؤں کے جوتے دالیاں پاؤں ڈال رہا تھا،

پھر مکان سے نکلنے کے بعد ان میں سے اکثر برسوں کے بعد پہلی بار بھاگنے کی مشق

کر رہے تھے۔

”تم پہلے تسلی کر لو دروازہ کھلتے ہی بیٹروں کے ریوڑ کی طرح اوپر بھاگے کی کوشش کریں گے۔ خدا کے لیے انہیں خاموش کرو۔ دروازے میں دھکی کسی کا سر پھوڑ ڈالوں گا۔“ یہ ابھی خاموش ہو جائیں گے۔

مظلم علی نے ایک رضا کار کے ہاتھ سے بندوق لی اور صحن کی طرف منہ کر کے ہوا میں فائر کر دیا۔

ایک ثانیہ کے اندر اندر کے ہر گوشے میں سناٹا چھا گیا۔ مظلم علی نے لوگوں کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

”بھائیو اور بہنو! ابھی دشمن کی میل دور ہے اور صبح تک مرشد آباد پر حملے کا کوئی خطو نہیں۔ ہم نے تمہاری حفاظت کا پورا انتظام کر رکھا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر تمہاری افوازی کا یہی عالم رہا تو تمہارے محافظوں کے لیے یہ جینج پکار اور یہ بدلی دشمن کی گولیوں کی نسبت زیادہ خطرناک ثابت ہوگی میں تمہیں چند ضروری ہدایات دینا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا چاہتا ہوں کہ اگر کسی نے میری ہدایت کی خلاف ورزی کی تو اسکی حفاظت ہمارے ذمے نہیں ہوگی۔ ہم اسے اس جیٹی سے باہر نکال دیں گے۔ میری ہدایت یہ ہیں۔ وہ تمام آدمی جن کی عمر پچاس سال سے کم ہے۔ فوراً باہر نکل آئیں انہیں بیرونی صحن کی کونٹرویل میں جگہ دی جائے گی۔ خواتین جن کے ساتھ کم سن بچے ہیں بالائی منزل کے کمروں میں چلی جائیں۔ بڑی عمر کے لڑکے اور عرصیدہ بیمار لوگ دیوان خانے کے کمروں اور برآمدوں میں پناہ لے سکتے ہیں۔ جن خواتین کو بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہ مل سکے وہ نچلی منزل کے باقی کمروں میں رہیں۔

حملے کے وقت جو لوگ ٹھونے کے قابل ہوں اور جن کے پاس کوئی ہتھیار ہو وہ رضا کاروں کیساتھ شامل ہو جائیں اور باقی یہاں آجائیں۔ اگر بارش ختم نہ ہو تو وہ اندرونی صحن کے مورچوں میں پناہ لے سکیں گے۔ دروازے پر آمدورفت اور نچلی منزل کے کمروں میں ان کے لیے کافی جگہ ہوگی۔ دس منٹ کے بعد میں مکان کے تمام کمروں کا معائنہ کروں گا۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ کسی نے جان بوجھ کر

ایک ہی کمرے کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے مردوں کو عورتوں سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ایک دروازے سے نکلے ہیں اور دوسرے دروازے سے پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ مظلم علی نے کھلم کھلا جان میں آپ کو یقین دلایا ہوں کہ آؤ گئے کے بعد آپ کسی کی آواز نہیں سنیں گے۔ آئیے میرے ساتھ!“

حسین بیگ نے کہا: نہیں میں آؤ گئے کے لیے اندر جانے کی بجائے ساری رات یہاں کھڑا رہنا آسان سمجھتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اندر جا کر کسی کا گلا گھونٹ دوں گا۔

مظلم علی نے ڈیڑھی میں بج ہونے والے مسلح رضا کاروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”تم دروازہ بند کر دو اور میرے ساتھ آؤ۔“ رضا کاروں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ مظلم علی موسلا دھار بارش میں جیٹی کے اندرونی صحن کی طرف بڑھا۔ حسین بیگ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر بھاگتا ہوا ان کے ساتھ جا ملا۔ رہائشی مکان کے برآمدوں اور کمروں میں ایک طوفان حشر پھا تھا۔ حسین بیگ کے نوکر جگہ جگہ مشعلیں بے کھڑے تھے۔

مظلم علی برآمدے میں داخل ہوا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا۔ ”خاموش! خاموش!“ برآمدے میں اس کے پاس چند لوگ خاموش ہو گئے لیکن مکان کے باقی حصوں میں چیخے مچاتے انہوں نے جھوم کو اس کی آواز متاثر نہ کر سکی۔

مظلم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”آپ اوپر جا کر دیکھیں اگر بالائی منزل میں جگہ ہے تو عورتوں اور بچوں کو وہاں بھیج دیا جائے۔“

حسین بیگ نے جواب دیا: ”بالائی منزل پر عورتوں اور بچوں کے لیے کافی جگہ ہے لیکن مردوں کی ہمتی دیکھ کر میں نے میز می کے دروازے پر تالا لگا دیا تھا۔ وہ عورتوں اور بچوں کے لیے وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔“

”آپ تالا کھول دیں۔ میں انہیں سمجھاؤں گا۔“

اتنی دیر میں ان کے کئی اور ساتھی اس محلے میں جمع ہو چکے تھے۔ مرہٹوں نے اچانک مشرقی سمت میں جوبی کے قریب ایک دو منزلہ مکان کی چھت سے فائر شروع کیے تو اس طرف فضا کے محافظ ان کی گولیوں کی زد میں تھے۔ چند رضاکار زخمی ہوئے اور باقی باندی سے آنے والی گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے اپنے مورچوں میں دھب گئے۔ مرہٹوں کے چند دستوں نے اس موقع پر فضا سے فائدہ اٹھایا اور اچانک گلیوں اور مکانوں سے نکل کر فضا کے اس حصے پر دھاوا بول دیا۔ ان کے چند آدمیوں نے فضا کے ساتھ ہنس کی سیڑھیاں کھڑی کر دیں اور ان کی آنکھیں کوئی پچاس آدمی فضا پر پہنچ گئے۔ فضا کے محافظ اس پاس کے مورچوں سے نکل کر اس طرف بڑھے۔ لیکن مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ چند منٹ دست بردست لڑائی کے بعد مرہٹے فضا کے مشرقی حصہ پر قابض ہو چکے تھے اور جوبی کے محافظ صحن میں جمع ہو کر انھیں نیچے اترنے سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مظلم علی ڈوڑھی کی چھت پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے بیک رضاکار سے کہا "پسائی کے لیے نفاذ بجا دو۔"

رضاکار نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور بیرونی فضا کے محافظ نفاذ کے آواز سننے ہی اپنے اپنے مورچے چھوڑ کر اندرونی صحن کے دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔ مشرقی دیوار کے نیچے لڑنے والے رضاکاروں کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر مرہٹے انھیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مظلم علی جلدی سے نیچے اترا اور آٹھ دس فوجیوں کے ساتھ مرہٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس محلے کی شدت نے مرہٹوں کو چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور رضاکار ایک مظلم طریقے سے پسپا ہونے لگے۔

مرہٹوں نے اپنی فتح یقینی سمجھ کر چند آدمیوں کے پنج نکلنے کو زیادہ اہمیت نہ دی اور انھوں نے آگے بڑھ کر ڈوڑھی کا دروازہ کھول دیا۔ قریباً آٹھ سو مرہٹے سیلاب کے ریلے کی طرح بیرونی صحن میں داخل ہوئے۔ لیکن اس عرصہ میں اندرونی اور بیرونی چار دیواری کے درمیان کا وسیع

سیری وریات پر نہیں کیا تو اسے کسی اچھے سولک کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ آدھ گھنٹے کے بعد تمام مشعلیں بجادی جائیں گی۔ میں آپ کی تسلی کے لیے ہر ایک باریہ اعلان کرتا ہوں کہ صبح تک محلے کا کوئی خطرہ نہیں۔ آپ اپنی جگہ آرام سے لیٹے رہیں۔ اس وقت ہماری ساری توجہ جوبی کے دفاعی انتظامات پر مہم ہوتی چاہیے۔ اور میں یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ بلاوجہ ہمیں پریشان نہیں کریں گے۔

قریباً پون گھنٹہ کے بعد جوبی میں مکمل سکون تھا اور مظلم علی حسین بیگ سے کہہ رہا تھا "چچا جان! اب آپ اوپر جا کر اپنے کمرے میں آرام کریں۔ حسین بیگ نے جواب دیا: "میتا میں صحت شر سے گھبرا رہا تھا۔ اب مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ میں رضاکاروں کے ساتھ باہر کی فضا پر پہرہ دینا چاہتا ہوں۔"



اگلے دن دس بجے کے قریب میر صاحب کی قیادت میں مرہٹوں کا لشکر مرشد آباد کے مشافا میں ٹوٹ مار کر رہا تھا۔ حملہ آور فوج کے ایک دستے نے حسین بیگ کے محلے میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن گلی کے مورچوں سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر دیر بعد چند اور دستے آگئے اور انھوں نے ایک گلی کے ناکے کے آس پاس چند مکانات کی چھتوں پر قبضہ کر کے رضاکاروں کو پیچھے مٹا دیا اور محلے کے اندر داخل ہو گئے۔ محلے کی گلیاں اور مکانات خالی دیکھنے کے بعد انھوں نے حسین بیگ کی جوبی کی طرف توجہ کی اور ڈوڑھی کے دروازے پر حملہ کر دیا۔ اچانک ڈوڑھی کی چھت اور فضا کے مورچوں سے گولیاں برسنے لگیں اور وہ گلی میں چند لاشیں چھوڑ کر اس پاس کے مکانات میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کے ایک اور دستے نے دوسری طرف سے فضا کے ایک حصہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن جوبی کے محافظوں نے اسے بھی مار کر پیچھے مٹا دیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ وہ اس پاس کے مکانات کی چھتوں پر لیٹ کر گولیاں چلاتے رہے۔

اُسے کے جینا مٹوں نے دروازے کے سامنے کئی گرنگ لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

اس کے بعد حملہ آفرینوں نے دروازے کو ہزاروں خنقوں اور کھانوں سے زیادہ خطرناک کچھ کر دیانی دیوار کی اوٹ میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کے سوسے زیادہ آدمی ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔ قریباً دو گھنٹے اور گزر گئے اور حویلی کے محافظوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ٹوٹے ہوئے دروازے کے قریب دیوار کے عقب سے سفید جھنڈا نمودار ہوا۔ اور کسی نے بلند آواز میں کہا:

”ہم صلح کی بات چیت کے لیے ایک آدمی اندر بھیجنا چاہتے ہیں۔“

جب چند تانیے اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو کسی نے دوبارہ کہا: ”ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ صلح کی بات چیت کے لیے ہمارا ایک آدمی اندر اسکتا ہے یا نہیں؟“

معظم علی صحن کے مورچے سے نکل کر چند قدم آگے بڑھا اور اس نے جواب دیا: ”تم ایک آدمی اندر بھیج سکتے ہو۔“

مرہٹہ فوج کا ایک افسر سفید جھنڈا اٹھاتے دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور رستے میں بکھری ہوئی لاشوں سے بچ کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ معظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر رکا اور بولے: ”میں تمہاری تیاری کا علم نہ تھا اور ہم نے اپنی غلطی سے اتنا نقصان اٹھایا ہے لیکن تمہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم اتنا نقصان اٹھانے کے بعد غالی ہاتھ واپس چلے جائیں گے۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”میں اس سے زیادہ کسی بات کی خواہش نہیں کرتا کہ تم میں سے کوئی واپس نہ جاسکے۔“

مرہٹہ افسر نے کہا: ”میں اس حویلی کے مالک کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”اس حویلی کا مالک ڈاکوؤں کے ساتھ بات کرنے کا عادی نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم ایک لاکھ روپے کے عوض اپنی جانیں بچا سکتے ہو۔“

محاط حویلی کے محافظوں سے خالی ہو چکا تھا۔ مرہٹہ لشکر کا ایک سردار چلایا: ”بہادر! ہمارے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ دیوار بچانہ کر اندر داخل ہو جاؤ!“

سپاہیوں نے کسی وقت کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن چند تانیے بعد وہ اپنے ساتھیوں کو خنق میں گرفتار کر رہا تھا۔ بدحواسی کی حالت میں چلا رہا تھا۔ یہ مکان نہیں قلعہ ہے۔ ہم نے مفت میں اتنی جانیں گنوانی ہیں۔ دروازے کی طرف بڑھو!“

اندر دنی صحن کا دروازہ مرہٹوں کے بے پناہ جھوم نے ایک ہی دھکے میں توڑ دیا۔ وہ فوج کے نعرے لگاتے ہوئے ایک سیلے کی بیڑی کی طرح آگے بڑھے۔ اندرونی دروازے اور دوائی مکان کے درمیان کشادہ صحن کے وسط میں نصف دائرے کی شکل میں ایک کھائی تھی۔ جس کے دونوں سرے خنق سے ملے ہوئے تھے۔ اس کھائی کے اندر ساتھ رضا کار اپنے فوجیوں کی آواز کے منتظر تھے۔ کھائی کے چھ دو چھوٹے چھوٹے نیموں کے اندر توپیں نصب تھیں جن کا رخ دروازے کی طرف تھا۔

حملہ آور لشکر کا سردار کھائی سے چند قدم کے فاصلے پر دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا: ”مردم! اور مرہٹوں کا جھوم رک گیا۔“

مرہٹہ سردار نے قدرے وقف کے بعد کہا: ”اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تمہارا پھینک کر مورچوں سے باہر نکل آؤ، ورنہ ہم ایک آدمی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس محلے کے تمام لوگ اس مکان میں جمع ہیں۔ اگر تم اپنی عورتیں کی عزت اور بچوں کی جانیں بچانا چاہتے ہو تو تمہارا ڈال دو۔ ورنہ۔۔۔۔۔!“

سالار اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ مکان کی چھت سے بندوق چلنے کی آواز آئی اور وہ لوکھڑا کر منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی صحن اور برآمدوں کے مورچوں، مکان کی چھت اور کھڑکیوں سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ مرہٹے طیش میں آکر چند قدم آگے بڑھے اور پھر اپنے پاؤں دروازے کی طرف ہٹا گئے۔ اچانک یہ لے لے لے لے توپوں کے دو خونخوار دھماکے سنائی دیئے اور

ہوتے ہی ان کے ساتھ چندا در دے آئے۔ مغظم علی کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ نئے محلے کے لیے رات کی تاریکی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اندرونی دیوار کے پیچھے مرہٹوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے اس نے خندق کے ساتھ ساتھ ایک پھر لگا دیا۔ شمالی دیوار کے قریب پہنچ کر اسے کچھ آہٹ سنائی دی اور اس نے محسوس کیا کہ مرہٹے دیوار کے پیچھے زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔ مشرقی دیوار کے قریب پہنچ کر بھی اس نے یہ محسوس کیا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودی جا رہی ہے۔ شام کے دھندلکے میں وہ شمالی اور مشرقی دیوار کے ایک کونے میں آگے کے ایک بلند درخت پر چڑھا۔ چوٹی پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سیکڑوں آدمی دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔ اس نے جلدی سے نیچے اتر کر تمام مورچوں کا پھر لگایا اور رضا کاروں کو خبردار کیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی دیواریں گرانے کے بعد ایک فیصلہ کن حملہ کرنا چاہتا ہے، پھر وہ پچھلی منزل میں جمع ہونے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور انھیں ہدایت کی کہ اب یہاں کسی عورت، بچے یا بیکار آدمی کو نہیں رہنا چاہیے۔ وہ جن کے لیے بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہیں، چھت پر چلے جائیں۔ اگر مرہٹے یہاں تک آگئے تو تم میں سے ہر ایک کو اپنی بہنوں کے ناموس کی خاطر لڑنا پڑے گا۔ تھوڑی دیر بعد رضا کار مشرقی اور شمالی دیوار کے سامنے ریت کی دیوڑوں کے نئے مورچے بنا رہے تھے۔

کوئی دس بجے کے قریب مرہٹوں نے جنوب اور مغرب کی سمت باہر کے مکانات کی چھتوں سے دوبارہ فائرنگ شروع کی۔ مغظم علی نے مہاجر میدان کے اندر دوبارہ تمام مورچوں کا پھر لگایا۔ اور رضا کاروں کو یہ حکم دیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی طرف سے حملہ کرنے سے پہلے تھوڑا تو بدھری طرف مبذول کرنا چاہتا ہے تم اس فائرنگ کی پروا نہ کرو۔ مکان کی چھت سے چند آدمی دشمن کی گولیوں کا جواب دیتے رہیں گے لیکن باقی سب کی توجہ اس طرف رہنی چاہیے۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب یکے بعد دیگرے چند دھماکے سنائی دیے۔ اور شمال اور مشرق کی دیواریں جن کی بنیادیں کھودی جا چکی تھیں۔ کئی جگہ سے گر پڑیں۔ دیواروں میں شکافت

تم نے ہماری جانوں کی قیمت بہت کم لگائی ہے۔ اور ہمارے پاس روپوں کی بجائے

گولیاں ہیں۔

اچھی طرح سوچ لو!

تم جاسکتے ہو۔

مرہٹہ افسر نے قدرے وقفے کے بعد کہا۔ تم نے جی حاکم کا غلط اندازہ لگایا ہے ہمارا لشکر شہر کے دوسرے محلوں میں مصروف ہے۔ لیکن اگر ضرورت پڑی تو ہم ان سب کو یہاں لے آئیں گے۔

یہ جگہ کافی کشادہ ہے اور یہاں تمہارے تمام لشکر کی لاشیں سما سکتی ہیں۔ اور شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ہماری فوج تمہارے پیچھے آ رہی ہے۔

میں معلوم ہے لیکن جب وہ یہاں پہنچیں گے تو ان کے سامنے صرف تمہاری قبریں کھدنے کا کام ہوگا۔ ہم تمہیں آخری بار سوچنے کا موقع دیتے ہیں۔ اگر تم بعد میں رشاداد کے تمام خزانے بدلے قدموں میں ڈھیر کر گے تو بھی تمہاری بات نہیں سنی جائے گی۔

تم ایک لاکھ روپیہ مانگتے ہو۔ لیکن ہمارے پاس تمہارے لیے صرف گولیاں ہیں۔ تم جاسکتے ہو۔ تم تمہارے محلے کا انتظار کر رہے ہو۔

چھاتیس ریہہ اسطرح نہیں کرنا پڑے گا۔

مرہٹہ افسر یہ کہہ کر مڑا اور سفید جھنڈا زمین پر پھینک کر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر میں مرہٹوں نے اس پاس کے چند اونچے مکانات کی چھتوں سے فائرنگ شروع کر دی اور مغظم علی کے سامنے اس کے جواب میں عیثی کے رہائشی مکان کی چھت سے گولیاں برسانے لگی۔ عروب آفتاب تک بندوؤں کی یہ طانی جاری رہی۔ اس کے بعد مرہٹوں نے فائرنگ بند کر دی۔ ان کے بیشتر آدمی ابھی تک عیثی کے پردہ اٹھانے میں مصروف تھے۔ شام

معظم علی نے برآمدے کے سامنے ایک مورچے سے باہر نکل کر بلند آواز میں کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ دشمن شہر خالی کر رہا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ایک چال ہو۔ تم اپنے مورچوں میں چوکس رہو اور میری ہدایات کا انتظار کرو۔ میں اور پر جا کر دیکھتا ہوں۔"

معظم علی تاریکی میں احتیاط سے پاؤں اٹھاتا ہوا زمین کی طرف بڑھا۔ زمین پر پاؤں رکھتے ہی اسے کسی کی آواز سنائی دی: "کون ہے؟"

"میں ہوں چچا جان! معظم علی نے حسین بیگ کی آواز پہچان کر جواب دیا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مرہٹوں نے ایک ہک گولہ باری کیوں بند کر دی ہے؟"

"میرے خیال میں وہ دالیں جا رہے ہیں۔ اور اب حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن میں دراجھت پر جا کر تلسی کروں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

معظم علی کسی وقت کے بغیر زمین پر چڑھنے لگا۔ چھت پر پاؤں رکھتے ہی اسے ایک کونے سے ہندو چلنے کی آواز سنائی دی۔ چھت پر حسین بیگ کے اپنے نوکر دوں کا پھرا تھا اور وہ معظم علی کی ہدایات کے مطابق منڈیر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک چھت کے کونے میں کھڑا اہلین سے اپنی ہندو بھروا تھا۔ معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے غصہ بک ہو کر کہا: "بیوقوف اپنا سر نیچے رکھو!"

لیکن اس نے معظم علی کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کے ہاتھ ہندو بھرنے میں مصروف تھے اور لگا بھین میں آم کے ایک دوخت پر لگی ہوئی تھیں۔ معظم علی کو کسی رضا کار یا حسین بیگ کے نوکر سے علم بدلنے کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ اور کھانا چاہتا تھا کہ ہندو کا دھماکا سنائی دیا اور گولی سر کے بالوں کو چھوٹی ہوئی گر گئی۔ معظم علی جلدی سے دھک کر منڈیر کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

چند ثانیے اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اسے ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی: "آپ ٹھیک ہیں نا؟"

پڑنے کی دیر تھی کہ مرہٹوں نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ اندر سے بھی گولیوں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ لیکن حملہ آور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خندق عبور کرنے کے بعد بانس کی باڑ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ شدید نقصان اٹھانے کے بعد صحن کے اندر ادھر ادھر پھیل گئے اور زمین پر بیٹھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس دوران میں مرہٹوں کی فوج کے ایک حصہ نے براہ راست دروازے سے صحن پر تیرا کرنے کی کوشش کی لیکن رضا کاروں نے انھیں صحن کے درمیانی مورچوں کے قریب نہ آنے دیا۔ توپوں سے پھر ایک بار کام لیا گیا اور مرہٹے بھاری نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد لڑائی کا سارا زور شمال اور مشرق کی طرف تھا۔ حملہ آوروں کے لیے رات کی تاریکی جس قدر فائدہ مند تھی اسی قدر نقصان دہ بھی تھی۔ وہ دیواریں توڑنے کے بعد ایک ہک حملہ کر کے حویلی کے محافظوں کی سرانجامی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن رضا کاروں کی غیر متوقع مداخلت نے ان کے حوصلے پست کر دیے۔ تاریکی میں انھیں اپنے زخمی اور ہلاک ہونے والے ساتھیوں کی صیغہ تعداد کا علم نہ تھا۔ تاہم گولیوں کی بوچھاڑ میں زخمی ہونے والوں کی چیخیں ہر آن ان کی سرانجامی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ چند آدمی راستے کے مورچے توڑنے کے بعد مکان کے قریب پہنچ گئے لیکن دیواروں، خیموں اور لٹا ہونے والے مسلح آدمیوں کا جھوم کھول اور برآمدوں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ چند مرہٹے مارے گئے اور باقی پیچھے ہٹ گئے۔

تھوڑی دیر بعد چند حملہ آور مکان پر تیرا کرنے کی بجائے صحن کے درختوں کی آڑے لگاؤر باقی گری ہوئی دیواروں کے پیچھے چھپ کر فائر کرنے پر اکتفا کر رہے تھے۔



اُسی رات کو جب چاند نمودار ہو رہا تھا۔ شہر کے مختلف گوشوں سے فسادوں کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور مرہٹے ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے بے دردی دروازے کی طرف سینٹے گئے۔ حویلی کے محافظ ہندوؤں کے دھماکوں کی بجائے بھاگتے ہوئے دشمن کے پاؤں کی آہٹ سن رہے تھے۔

جان خطر سے جی نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔

- وہاں ایک نہیں تھا۔ میں نے اپنے کمرے کے درپے سے چار آدمی درخت پر چڑھتے

دیکھے تھے۔ ایک کو میں نے وہاں سے فار کر کے گرایا تھا۔ دو بھاگ گئے تھے۔ اور بچہ تھا

کمرے کے درپے سے میرے نشے کی زد میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے مجھے اوپر لانا پڑا۔

معظم علی نے چاند کی روشنی میں پہلی بار غور سے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے سر

پر سفید مٹی تھی اور گلے میں بارود کا تھیلانگ رہا تھا۔ معظم علی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس

نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

معظم علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتے ہوئے کہا: تم فرحت ہو؟

لڑکی نے شکایت کے لہجے میں کہا: آپ نے مجھے گالیاں دی ہیں!

مجھے کسی سپاہی سے حکم مدد کی توقع نہ تھی۔ اور تمہیں بلاوجہ جان خطرہ میں ڈالنے سے

منع کرنا میرا فرض تھا۔ لیکن اگر تم خفا ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

- میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔

معظم علی نے کہا: اب تم اطمینان سے نیچے جا کر سو جاؤ، اب مجھے کا کوئی خطرہ نہیں!

مرہٹے پسپا ہو رہے ہیں۔ گلی سے ان کے بھاگنے کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔

چھت کے پیریلر اٹھ کر صحن کی طرف بھاگے۔ اور ایک دوسرے کو یہ خوشخبری سناتے

گئے: مرہٹے بھاگ رہے ہیں۔ مرہٹے بھاگ رہے ہیں۔

معظم علی نے بھری ہوئی بندوق فرحت کی طرف بھڑکتے ہوئے اپنی بندوق واپس لے

لی اور کہا: اب شاید آپ کو اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔

فرحت کچھ کے بغیر زینے کی طرف پل دی اور معظم علی نے رضا کاروں کی طرف متوجہ

سو کر کہا: تم بہت غیر ذمہ دار ہو۔ اگر مرزا صاحب کی صاحبزادی اپنی بے احتیاطی کے باعث زخمی

ہو جائیں تو ہم انہیں کیا سزا دکھاتے؟

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن خودکشی کا انسان طریقہ یہ ہے کہ تم گولی کا انتظار کرنے کی بجائے آنکھیں بند کر کے نیچے چھلانگ لگا دو۔ یہ کہہ کر معظم علی نے جلدی سے گھٹنوں کے بل آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے کچھ کر نیچے بٹھایا۔

"یہ گولی سامنے کسی درخت سے آئی تھی؟" معظم علی نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"تم کون ہو؟"

اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پا کر معظم علی نے کہا: تم ذرا نیچے چلی جاؤ۔ لڑکیوں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔"

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور گھٹنوں کے بل ہو کر صحن کی طرف بھاگنے کے بعد اچانک ایک فائر کر دیا۔

معظم علی نے گردن اوپر کر کے صحن کی طرف دیکھنے کے بعد کہا: تم ہوا میں فائر کر رہی ہو اور دیکھو گردن نیچے رکھو!"

لڑکی نے کہا: اگر آپ مداخلت نہ کرتے تو میرا نشانہ خالی نہ جاتا۔ اب وہ دوسری شاخ پر جا چکا ہے۔ یہ میری بندوق بھر دیکھیے اور مجھے اپنی بندوق دیکھیے۔ جلدی کیجیے وہ نیچے اترنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"یہ لو! معظم علی نے اپنی بندوق آگے بڑھاتے کہا: تم اسے دیکھ سکتی ہو؟"

"ہاں۔ لڑکی نے اٹھ کر نشانہ باز رہتے ہوئے کہا۔

خدا کے لیے اپنا سر نیچے رکھو۔" معظم علی نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں آخری بار آپ کی حکم مدد لی کر رہی ہوں۔ لڑکی نے یہ کہہ کر بندوق چلا دی۔ صحن میں

آہ کے درخت سے کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز آئی۔

معظم علی نے کہا: اب تمھاری ضد پوری ہو چکی ہے۔ لیکن ایک مرہٹے کے لیے تمہیں اپنی

معظم علی نے رضا کاروں کو مشعلیں جلانے کا حکم دیا اور باندے کی سیڑھی پر کھڑا ہو کر بند آواز میں کہا: "بھائیو! کروں کے اندر خواتین اور بچے گرمی کے باعث سخت تکلیف میں ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اب تمام مرد و عورتوں کے بیرونی احاطے میں چلے جائیں تاکہ ہماری بہنیں باقی رات کھلی ہوا میں سانس لے سکیں۔ مسلح رضا کاروں کے لیے میرا یہ حکم ہے کہ وہ صبح تک بیرونی فصیل کے مودچوں میں پہرہ دیں۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ مرہٹے دوبارہ حملہ کریں گے تاہم میں نے احتیاط کے طور پر چند آدمیوں کو باہر کے راستوں پر پہرہ دینے کے لیے بھیج دیا ہے۔ آپ کورات کا کھانا نہیں ملا۔ مرزا صاحب نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ دو گھنٹوں کے اندر اندر آپ سب کے لیے دسترخوان بچھا دیئے جائیں گے۔"

حسین بیگ کے ایک نوکر نے کہا: جناب ان کے لباس سے دھوکا ہوا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ کوئی رضا کار ہے۔"

"لیکن کسی رضا کار کو بھی چھت پر کھڑا ہونے کی اجازت نہ تھی۔ تمہارا فرض تھا کہ تم انہیں بے احتیاطی سے منع کرتے!"

حسین بیگ کے نوکر نے جواب دیا: "ہم نے انہیں منع کیا تھا۔ لیکن انہوں نے ہماری طرف توجہ دینے کی بجائے اچانک ہندوق چلا دی۔ اتنی دیر میں آپ پہنچ گئے۔"

معظم علی نے اٹھ کر چھت کی چاروں طرف متوجہ ہو کر کہا: میرے خیال میں اب میدان خالی ہو چکا ہے۔ لیکن جب تک مجھے حویلی کے باہر کے حالات کے متعلق تسلی نہیں ہوتی تب تک چوکس رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تک چند آدمی درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی پندرہ رضا کاروں کے ساتھ اندرونی صحن کے طول و عرض میں چکر لگانے کے بعد باہر کے احاطے میں پہنچا۔ حمد اور رفیع ہو چکے تھے۔ حویلی کے مختلف گوشوں میں دشمن کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور جگہ جگہ زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں، مرہٹے حسین بیگ کے احاطے سے بے گھر ہوئے اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔

معظم علی رضا کاروں کے ساتھ حویلی سے باہر نکلا۔ قریباً ایک گھنٹہ محلے کی گلیوں میں چکر لگانے کے بعد اس نے واپس آکر اعلان کیا: "مرہٹے جا چکے ہیں۔ خدانے ہماری مدد کی ہے اب اس کی بارگاہ میں سجدوں کا وقت ہے۔"

عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان خوشی کے نعروں اور مسرت کے آوازوں سے اس کے اعلان کا خیر مقدم کر رہے تھے مکان کے اندر خواتین معظم علی کی ماں کے گرد جمع ہو کر تشکر اور احسان مندی کے جذبات کا اظہار کر رہی تھیں اور مکان سے باہر مردوں کا ہجوم معظم علی کو نکالے میں لیے ہوئے تھا۔ وہ ان کے لیے ایک قابل فخر مینا، ایک قابل عزت بھائی اور ایک قابل اعتماد دوست بن چکا تھا۔

چوتھا باب

صبح کی نماز کے بعد محلے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ معظم علی تھکاوٹ سے نڈھال ہو کر دیوان خانے کے برآمدے میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دس بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو محمود علی، یوسف، حسین بیگ، آصف اور افضل اس کی چارپائی کے گرد کھڑے سکر رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر یکے بعد دیگرے اپنے باپ، بھائی، اور دوستوں سے بغل گیر ہوا۔ افضل نے کہا: "معظم تم نے تو ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا ہے!" حسین بیگ بولا: "بیٹا اگر مہیے میں ایک دو ماہ اور مہلت دیتے تو معظم اس محلے کے ہر مکان کا نقشہ بدل دیتا۔" محمود علی نے کہا: "ہم راستے میں بہت پریشان تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ورنہ یہ محلہ بہت غیر محفوظ تھا۔" حسین بیگ نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ اب محلے کے لوگ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔ ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر معظم کا قیاس غلط ثابت ہوا تو مجھے اس شہر سے ہجرت کرنا پڑے گا" سلطان خان نے میرا مذاق اڑانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لیکن جب مرہٹوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ سارے شہر سے اپنی برادری کے لوگوں کو جمع کر کے یہاں آگیا تھا۔ رات کے وقت وہ میرے کتب خانے میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ لوگ تاریکی میں اسے ٹھوکریں مارتے

تھے۔ لیکن وہ اُن تک نہیں کرتا تھا۔

معظم علی نے سوال کیا: چچا جان! آپ نے شہر کے حالات معلوم کیے ہیں؟ حسین بیگ نے جواب دیا: شہر میں مرہٹوں نے کافی لوٹ مار کی ہے۔ جگت سیٹھ کے محل سے وہ بیس لاکھ روپیہ نکال کر لے گئے ہیں۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم شہیدوں کے نازے کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اس کے بعد شام کے چار بجے تمہیں میرمدن کے پاس جانا ہے: "میرمدن کے پاس؟"

"ہاں تم سو رہے تھے انھوں نے تمہیں جگننے کی اجازت نہیں دی۔"

"وہ یہاں آئے تھے؟"

"ہاں وہ آئے تھے اور جلی کا معائنہ کرنے کے بعد واپس چلے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ فوج کے چند اور افسر بھی تھے۔ وہ تمہاری کارگزاری پر بہت خوش تھے۔"

معظم علی نے سوال کیا: انھیں آپ نے یہاں بلایا تھا؟

حسین بیگ نے جواب دیا: "بیٹا انھیں یہاں آنے کے لیے کسی کے بلانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے لیے یہ خبر کافی تھی کہ اس حلی میں دو سو مرہٹوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔"

محمود علی نے کہا: "راستے میں ہماری طرح میری مدین بھی اس محلے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ مرزا صاحب کی حویلی بہت غیر محفوظ ہے۔ لیکن شہر میں داخل ہوتے ہی جب ہمیں مرہٹوں کے نقصانات کی اطلاع ملی تو انھوں نے کہا کہیں سب سے پہلے مرزا صاحب کی حویلی دیکھنا چاہتا ہوں۔"



شام کے چار بجے معظم علی شاہی محل کی چل دیوادی کے اندر میرمدن کے مکان میں داخل ہوا۔ ایک سپاہی اسے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں ایک نوجوان افسر کے پاس لے گیا۔

میرمدن نے کہا: میں تمہاری کارگزاری دیکھ چکا ہوں اور مجھے تم پر فخر ہے۔
میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" معظ علی نے احسان مندی سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے
جواب دیا۔

میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ بنگال کی فوج کو تم جیسے فوجیوں کی ضرورت ہے۔
مرزا حسین بیگ کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمہیں فوج کی عازمت پسند نہیں۔ میں یہاں
ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا میں صرف ایک سپاہی ہوں اور ایک سپاہی کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے
کہ میں تمام کارآمد فوجیوں کو اپنے گرد جمع کروں۔ محلے کی حفاظت کے سلسلہ میں تمہاری کارگزاری
دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمہارے سیاسی نظریات خواہ کچھ ہوں۔ موجودہ حالات میں تم
بنگال کی فوج کے لیے اپنی خدمات کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکو گے۔ مرہٹوں کے ساتھ
گذشتہ لڑائیوں میں میرے چند بہترین سالار شہید ہو چکے ہیں اور میری دلی خواہش ہے کہ ان میں سے
ایک کی جگہ اسی وقت پر کردی جائے۔ آج تک میں نے عہدوں کی تقسیم کے لیے کسی کی سفارش
قبول نہیں کی۔ لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔"

معظ علی نے پریشان ہو کر کہا: اگر مرزا صاحب نے میری سفارش کی ہے تو مجھے بہت
انسوس ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سمجھنے میں غلطی نہیں کریں گے۔

میرمدن نے مسکراتے ہوئے کہا: برخوردار! مرزا حسین بیگ نے نہیں بلکہ ان کی حویلی
میں بڑی ہوئی دو سو مرہٹوں کی لاشوں نے تمہاری سفارش کی تھی۔ پھر جب میں تمہارے محلے کی گلیوں
سے گزر رہا تھا تو بچوں اور بوڑھوں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو مجھے یہ پیغام دے رہے تھے
کہ اس محلے میں ایک فوجیوں ایسا ہے جس کی عزت، محبت اور ذہانت پر تم اعتماد کر سکتے ہو۔
معظ علی نے کہا: لیکن میں نے صرف ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کوئی قابلِ فخر
کارنامہ نہیں۔"

"تم نے ایک چھوٹی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اب میں تمہیں ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنے

تشریف رکھیے۔" افسر نے اپنے سامنے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا
میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

معظ علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: میرا نام معظ علی ہے اور مجھے میرا صاحب نے
بلایا ہے۔"

افسر چونک کر کرسی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔
آپ محمود علی کے صاحبزادے ہیں؟ معاف کیجیے۔ میں آپ کو بڑی عمر کا آدمی سمجھتا تھا۔ میر
صاحب چند افسروں سے بات کر رہے ہیں۔ آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔
معظ علی افسر سے مصافحہ کرنے کے بعد دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند تانیے خاموشی سے
معظ علی کی طرف دیکھنے کے بعد افسر نے کہا:

"میرا نام گوہر خان ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"
تھوڑی دیر بعد فوج کے چند افسروں کو دیوان خانے کے ایک کمرے سے باہر نکلتے دیکھ
کر گوہر خان نے کہا:

"پہلے اب وہ فارغ ہو گئے ہیں۔"
معظ علی گوہر خان کے پیچھے ہو لیا۔ جمن عبور کرنے کے بعد وہ دیوان خانے کے برآمدے
میں داخل ہوئے اور گوہر خان معظ علی کو رکنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہوا۔ چند تانیے بعد اس
نے باہر نکل کر معظ علی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔
سطوت و جبروت کا ایک پیکر عجم کرسی سے اٹھ کر دو تین قدم آگے بڑھا اور معظ علی کے ساتھ
مصافحہ کرتے ہوئے بولا: مجھے انسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ میں بہت مصروف تھا۔
مجھے آپ کی مصروفیت کا احساس ہے۔"

"بیٹھ جاؤ۔"

معظ علی میرمدن کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں ابھی فیصلہ کرتا ہوں۔ میں کل ہی اپنے دستے کی کمان سنبھال لوں گا۔



علی دردی خاں مرشد آباد میں اپنی افواج کو لازماً منظم کر رہا تھا کہ مرشد افواج نے میر حبیب کی قیادت میں اچانک ہنگامی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ برسات کی وجہ سے مرشد آباد سے رستہ دھمک کے راستے بند ہو چکے تھے اور مرشد کسی موثر مزاحمت کا سامنا کیے بغیر بردوان، میدانا پورا اور بامر کے علاقوں میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ اور چند ہفتوں میں حالت یہ ہو گئی کہ مرشد آباد کے جنوب مغرب میں کوئی علاقہ مرہٹوں کے حملوں کی زد سے محفوظ نہ تھا۔

برسات کی شدت کم ہوتے ہی علی دردی خاں نے پوری تیاری کے ساتھ مرشد آباد سے پیش قدمی کی اور کوٹے کے قریب دریائے بھاگرتی کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے۔ مرشد افواج نے چاروں طرف سے سمٹ کر بھاگرتی کے دوسرے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ قریباً آٹیس دن فریقین اپنے اپنے کیمپوں سے ایک دوسرے پر گولہ باری کرتے رہے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کو یہ اطلاع ملی کہ اودھ کا صوبہ دار اپنے لشکر کے ساتھ علی دردی خاں کی مدد کے لیے آ رہا ہے چنانچہ انھوں نے ایک گھسان کی جنگ کے بعد سپانی اختیار کی۔ چند دنوں میں علی دردی خاں کی افواج نے مرہٹوں کو بردوان، ہنگامی اور میدانا پور کے علاقوں سے نکال دیا۔ ہر محاذ پر مرہٹوں کی عام سپانی شروع ہو چکی تھی اور ہنگامی فوج کے تیز رفتار ہراول دستے ان کی افزائش سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

معظم علی ہراول دستوں کے ان چند افسروں میں سے ایک تھا جو پورے لشکر کی توجہ کا مرکز بن چکے تھے۔ دشمن کے تعاقب میں یہ لوگ باقی فوج سے ہمیشہ ایک منزل الگ رہتے تھے۔ مرشد فوج کئی کئی کوس چلنے کے بعد کسی محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈالتی۔ لیکن یہ لوگ اچانک محاذ کے ان کو دوبارہ بھاگنے پر مجبور کر دیتے۔ معظم علی کی کمان میں پانچ سو سوار تھے اور وہ چند دنوں میں دشمن کے پیچھے توپوں اور سامانِ رستہ کی ستر گاڑیوں پر قبضہ کر چکا تھا۔

کی دعوت دے رہا ہوں۔

معظم علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: اگر یہ دعوت کسی اور کی طرف سے ہوتی تو میں سوچے بغیر انکار کر دیتا لیکن آپ کے سامنے بات کرنا بھی میرے نزدیک گستاخی ہے۔ قصبات کرنے کی ضرورت نہیں: میرمدن نے یہ کہہ کر قلم اٹھایا اور کانڈ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ جب وہ فارغ ہوا تو معظم علی نے کہا: میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گا۔ میرے تذبذب اور پریشانی کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس قیادت سے مطمئن نہیں ہو سکتا جو قوم کے اجتماعی تقاضوں کی بجائے اپنی ضروریات کے مطابق دوستوں اور دشمنوں کے متعلق اپنا زادیہ نگاہ برتی رہتی ہے۔

میرمدن نے کھٹا ہوا کانڈ معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: سپاہی ہمیشہ سیاستدانوں کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرتے ہیں۔ اور تم ایک سپاہی ہو۔ میں بنگال کی فوج کو ان عناصر سے پاک کرنا چاہتا ہوں جو قوم کے مستقبل کے متعلق ہمیشہ موقع پرست سیاستدانوں کے ذہن سے سوچتے ہیں اور قصاصے جیسے حقیقت پسند اور فرض شناس فوجیوں کے تعاون کے بغیر کام نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم کسی دن فوج کے سپاہیوں میں وہ اجتماعی ضمیر پیدا کر سکو گے۔ جو سیاسی طامع آزموں کی کوتاہیاں برداشت نہیں کرے گا۔ یہ قصاصی تقریری کا حکم نامہ ہے۔ میں تمہیں دو دن سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ اگر تم نے دو دن کے بعد فوج میں حاضری زدی تو یہ حکم نامہ خود بخود منسوخ ہو جلتے گا۔ اور مجھے اس بات کا انخوس ہو گا کہ میں ایک مضبوط پتھر کو قوم کے دغائی حصار کی تعمیر کے لیے کام میں نہ لاسکا۔ مرشد آباد میں اب کچھ عرصہ حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن جنوب مغربی اضلاع کے لیے خطرہ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ میر حبیب سے زیادہ ہماری کمزوریوں سے کوئی واقف نہیں۔ وہ مرشد آباد میں اپنی ناکافی کا بدلہ لینے میں تاخیر نہیں کرے گا۔

معظم علی نے کہا: میں جانتا ہوں کہ اس وقت بردوان، میدانا پورا اور ہنگامی کے علاقے خطرے میں ہیں اور اگر میں ایک سپاہی ہوں تو مجھے سوچنے کے لیے دو دن کی ضرورت نہیں

میرمن مسکرایا: "عالیجاہ میں فوج کو تیاری کا حکم دے آیا ہوں۔ صرف آپ سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔"

"کتنے سپاہی لے جا رہے ہو؟"

"پانچ ہزار۔"

"جاؤ!"

جب میرمن نیچے سے باہر نکل رہا تھا تو علی وردی خاں نے کہا:
"انشاء اللہ کل ہم وہ قلعہ دیکھنے آئیں گے۔"



میرمن کا قیاس درست تھا۔ معظم علی غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکا تھا۔ قلعے کی حفاظت کرنے والے پچاس سپاہیوں میں سے چوبیس ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔ پندرہ گرفتار ادراہانی ایک چور دروازے سے فرار ہو گئے تھے۔

معظم علی نے قلعے کے برج پر بنگال کا جھنڈا نصب کرنے کے بعد اپنے سپاہیوں سے کہا:
"بہادر! مجھے معلوم ہے کہ تم بہت تھکے ہو۔ لیکن آج رات شاید تمہیں کوئی نصیب نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر تک سرہٹوں کا شکر یہاں پہنچ جائے گا۔ لیکن اگر تم مجھ تک قلعے پر قبضہ رکھ سکیں تو انشاء اللہ ہماری فوج پہنچ جائے گی اور ہمارے مقدر میں ایک اور شاندار فتح ہوگی۔ لیکن اگر تم نے ہمت ہار دی اور سرہٹے دوبارہ قلعے پر قابض ہو گئے تو ہمارے لیے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ قلعے میں اتنا بارود ہے کہ ہم چند گھنٹے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ رات کے وقت ہمیں فیصلے کے ہر حصے پر چوکس رہنا چاہیے۔"

سرہٹ فوج کے سرداروں کو اس بات کا یقین تھا کہ علی وردی خاں کا لشکر ان کا مزید تعاقب نہیں کرے گا اور وہ سرحدی قلعے میں پناہ لے کر اپنے مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکیں گے۔ لیکن کوئی دکانس کے فاصلے پر قلعے سے فرار ہونے والے سپاہیوں نے انہیں یہ خبر دی کہ

علی وردی خاں نے اڑیسہ کی سرحد تک، سرہٹوں کا تعاقب کیا۔ ایک شام بنگال کی افواج نے جھیل چھلکا کے کنارے پڑاؤ ڈالا اور علی وردی خاں نے افسروں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ یہ ہماری آخری منزل ہے۔ اب اس سے اگے جانا بے سود ہے۔

رات کے وقت جب فوج فتح کا جشن منا رہی تھی۔ میرمن، علی وردی خاں کے نیچے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "عالیجاہ! مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہرادل فوج کے ایک سالار نے واپس آنے کی بجائے یہاں سے کوئی چوہہ میل دور دشمن کے ایک قلعے پر حملہ کر دیا ہے۔"

علی وردی خاں نے برہم ہو کر کہا: "یہ میرے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ میں نے تمام فوج کو یہاں جمع ہونے کا حکم دیا تھا۔ وہ سالار کون ہے؟"

"عالیجاہ وہ معظم علی ہے۔"

"لیکن ہرادل فوج کو سرحد عبور کرنے کی اجازت نہیں تھی!!"

"عالیجاہ اس نے سرحد عبور نہیں کی۔ یہ قلعہ ہمارا تھا اور مرہٹے چند سال سے اس

پر قابض چلے آتے ہیں۔"

اور وہ احمق یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پانچ سو سپاہی مرہٹوں کے تمام لشکر کو موت کے

گھاٹ اتار کر قلعے پر قابض ہو جائیں گے؟

"عالیجاہ! میرے خیال میں وہ اب تک قلعے پر قابض ہو چکا ہوگا۔ جو اطلاع مجھے ملی

ہے اس کے مطابق وہ ہرادل کے باقی دستوں سے کٹ کر مرہٹوں کے لشکر سے اگے نکل گیا

تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کے دلوں میں پینے سے پہلے قلعے پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب مجھے

یہ اندیشہ ہے کہ اگر اسے کمک نہ بھیجی گئی تو مرہٹوں کا لشکر وہاں پہنچے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لے گا

اور ہماری فوج کے پانچ سو بہترین سپاہی مارے جائیں گے۔"

علی وردی خاں نے کہا: "اگر صورت یہ تھی تو تمہیں کمک بھیج کر میرے پاس آنا چاہیے تھا۔"

میرا یہ اقدام آپ کی منشا کے عین مطابق تھا۔

میرمدن نے مگر محمود علی کی طرف دیکھا اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "لیکن تمہارے سپاہی تھکے ہوئے تھے۔ انہیں آرام کی ضرورت تھی!"

ایسے حالات میں سپاہی کے لیے گھوڑے کی زین بستر سے زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی معلوم تھا کہ یہ قلعہ ان کے سفر کی آخری منزل ہے اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد وہ جی بھر آرام کر سکیں گے۔

میرمدن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کہا: "مظفر علی تمہاری کارنامہ میری توقع کے عین مطابق تھا لیکن تم نے میں آرام کی دعوت نہیں دی؟" مظفر علی نے جواب دیا: "اندھ چلے، میں نے آپ سب کے لیے آرام کا انتظار رکھ لیا ہے۔"

دوپہر کے وقت قلعے سے باہر ایک کشادہ نیچے کے اندر علی دردی خاں کا دربار لگا ہوا تھا اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے سامنے کھڑے تھے۔ مظفر علی جیسے کے اندر داخل ہوا اور وہ جنگل کے مکران کو سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔

علی دردی خاں نے گاؤں کے کاٹکے کا سہارا چھوڑ کر سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا:

"تو جوان! ہم یہ جانتا چاہتے ہیں کہ تم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟"

مظفر علی نے جواب دیا: "عالی جاہ! مجھے یقین تھا کہ میں چند گھنٹے اس قلعے پر قبضہ رکھ سکتا ہوں اور اتنی دیر میں سپہ سالار تک بھیج دیں گے۔"

"لیکن ملک پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو کیا ہوتا؟"

"عالی جاہ! میں نے یکے بعد دیگرے آٹھ سو اڑھائی طرف روانہ کر دیئے تھے اور میرمدن کی موجودگی میں ملک کے دیر سے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

رات کے وقت اس قلعے کی طرف تھاری تھانی آنے والے تھے۔

جنگل کے مٹی بھر سپاہی قلعے پر قابض ہو چکے ہیں۔ مرہٹہ سردار قلعہ کے محافظوں کو بڑی ادب سے غیرتی کا طعنہ دیتے ہوئے آگے بڑھے اور اسی رات کے قریب انہوں نے قلعے سے کوئی آدھ میل دور شمال کی جانب چڑ ڈال دیا۔ اس کے بعد میرحبیب اپنے پانچ ہزار آدمیوں کے ساتھ لے کر آگے بڑھا اور اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

پچھلے پر شہید گولہ باری کے بعد مرہٹوں کا شکر چاروں طرف سے قلعے پر لگنا کر رہا تھا اور مظفر علی کے ساتھی ملک پہنچنے کی امید پر اپنے مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اچانک جنوب مشرق کی سمت سے گولیوں کی بارش ہونے لگی اور مرہٹہ فوج میں افرتی پھیل گئی۔ وہ مغرب کی طرف سمٹنے لگے۔ مظفر علی دیر بعد مغرب کی طرف بھی درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ سے مرہٹوں پر گولیاں برسنے لگیں اور کوئی آدھ گھنٹے بعد مرہٹے انتہائی انتشار کی حالت میں شمال کی طرف ہٹا گئے تھے۔

میرمدن نے اپنے سواروں کو عام حملے کا حکم دیا اور ان کی آن میں میدان خالی ہو گیا۔ جنگل کی فوج پڑاؤ تک مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آگئی۔

صبح کے دھندلے میں مظفر علی اور اس کے ساتھی قلعے سے باہر نکل کر میرمدن کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

میرمدن کے حاکم بائیں محمود علی، دوست بائیں افضل بیگ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ میرمدن نے ان کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور مظفر علی سے مخاطب ہو کر کہا: "تمہیں اس قلعے پر حملہ کرنے کا حکم کس نے دیا تھا؟"

یہ سوال ادب و ادب و ادب مظفر علی کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ ایک تائید کے لیے مذہب اور پریشانی کی حالت میں میرمدن کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے باپ بھائی اور دوستوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب سکرا رہے تھے۔ مظفر علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔

"لوئے! کیوں نہیں؟ میرمدن نے ذرا سخت جے میں سوال کیا۔"

مظفر علی نے جواب دیا: "اس قلعے پر حملہ کرنے کے لیے مجھے کسی نے حکم کی ضرورت نہ تھی۔"

اگلے دن معظم علی کے سپاہی اس قلعے کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کی مرمت کا کام شروع کر چکے تھے۔

ایک سال بعد کٹاک کا فوجدار اس قلعے کے معائنے کے لیے آیا تو اس نے علی دروہی خاں کو یہ خط لکھا:-

ایک سال بعد یہ قلعہ دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ میں غلطی سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔ معظم علی نے اس کا نقشہ بدل دیا ہے۔ ٹوٹی ہوئی فصیل کی جگہ ایک نئی فصیل تعمیر ہو چکی ہے۔ قلعے کے اندر سپاہیوں کی رہائش کے لیے نئی کوٹھڑیاں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ اور فصیل سے باہر خندق کھودنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس قلعے کی تعمیر نو کے لیے جو رقم منظور کی گئی تھی وہ بہت قلیل تھی اور معظم علی نے اخراجات بچانے کے لیے تعمیر اور مرمت کا بیشتر کام اپنے سپاہیوں سے لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر معظم علی کچھ عرصہ اور یہاں رہا تو دفاعی لحاظ سے ہمارا یہ سرحدی قلعہ بہت مضبوط بن جائے گا۔

اس قلعے کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کے علاوہ معظم علی نے ارد گرد کے جنگلات مرہڑ ڈاکوؤں سے پاک کر دیے ہیں اور سرحد کی اجڑی ہوئی بستیوں و آبادیوں کو اس قلعے کی حفاظت کے لیے مقامی رضا کاروں کی فوج معظم کی جا رہی ہے اور اب تک معظم علی کے سپاہی قریباً ایک ہزار آدمیوں کو فوجی تربیت دے چکے ہیں۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق معظم علی سے یہ کہا تھا کہ اگر تم جاہلو تو تمہیں مرشد آباد تبدیل کیا جاسکتا ہے، میرا خیال تھا کہ وہ یہ بات سن کر خوشی سے اچھل پڑے گا۔ لیکن اس نے مجھے یہ جواب دیا کہ ابھی اس علاقے میں میرا کام ختم نہیں ہوئے، ابھی اس علاقے میں امیر نوآباد ہونے والے لوگوں کو میری ضرورت ہے اور یہ ضرور معظم علی میں ہی نہیں بلکہ اس کا ہر سپاہی محسوس کرتا ہے کہ اسے کوئی اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

مجھے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہ تھی۔ میں اس علاقے کا ہر نشیب و فراز اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا ہوں۔

علی دروہی خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "نوجوان! میں تمہیں اس قلعے کا محافظ مقرر کرتا ہوں۔ اگر تمہارے متعلق میرے مدین کے خیالات صحیح ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کرو گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "عالی جاہ! میں میرے مدین کی توقعات پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔"

چوتھے روز معظم علی اس قلعے کے کماندار کی حیثیت میں بنگال کے لشکر کو اطلاع کہہ رہا تھا۔ قلعے کے قریب ایک بند ٹیلے سے بنگال کی افواج کی آخری جھجک دیکھنے کے بعد اس نے اپنے پیچھے سو سپاہیوں کو قلعے کی چار دیواری کے اندر جمع ہونے کا حکم دیا اور ان کے سامنے تقریر کی:-

"میرے ساتھیو! تم مجھے مغرور نہ نظر آئے ہو۔ ہم اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور پھینک دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہمیں اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ ہمیں ایک بہت بڑی ذمہ داری کا اہل سمجھا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قلعہ بنگال کی ایک دروازہ ہے جو کہ نہیں بلکہ مرشد آباد کے ایک دروازے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس دیرانے میں وہ کران گھروں کی حفاظت کریں گے جو یہاں سے سینکڑوں کوس دور ہیں اور ہمیں یہ یقین ہوگی کہ ہماری دھڑ سے ہماری قوم کے لاکھوں افراد آرام کی نیند سوتے ہیں۔

میرے مدین نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس قلعے کو مستحکم بنانے کے لیے وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے اور میں ان کے ساتھ یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ ہے، اس قلعے پر بنگال کا پرچم لہراتا رہے گا۔ یہ قلعہ بہت اہم ہے اور ہمیں اسے ناقابل تسخیر بنانا ہے۔"

پانچواں باب

دن مہینوں اور جہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ سرحدی قلعے کے کمان دار کی حیثیت میں معظم علی کی زندگی کا کوئی لحاظ نہ تھا جب وہ مرشد آباد کے متعلق نہیں سوچتا تھا۔ کبھی وہ بچپن کے ان ایام کا تصور کرتا جب وہ یوسف، افضل اور آصف بیگ کے ساتھ اپنے محلے کی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ کبھی اسے اپنے والدین کا خیال آتا اور اسے قلعے کی فضائیں اور اس محسوس ہونے لگتیں بچپن اور جوانی کے ساتھیوں کی تصویریں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آتیں۔ اور بالآخر مرشد آباد کے متعلق اس کے تمام تصورات ایک مرکزی نقطے پر مرکوز ہو کر رہ جاتے۔ ایک ایسی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی جس کے کوئی مستقل خطہ حال اس کے ذہن پر نقش نہ تھے اور اس کی دنیا قوس قزح کی رنگینوں سے لبریز ہو جاتی۔ وہ رات کے وقت کھلی فضا میں لیٹے لیٹے کبھی بلند آواز میں اور کبھی دبی زبان سے فرحت کا نام پکارتا اور کائنات کی وسعتیں ستاروں کے نمونوں سے لبریز ہو جاتیں۔ لیکن پھر اچانک تصورات کے یہ سحرے تار ٹوٹ جاتے اور وہ گری نیند سو جاتا۔

ایک حقیقت پسند انسان کی طرح اس نے کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہیں کی تھی کہ زندگی کی کسی منزل میں فرحت اور اس کا راستہ ایک ہو سکتا ہے تاہم فرحت نے متعلق مہجور، دکش اور دلفریب تصورات اس کے خیالوں اور سپنوں کی دنیا پر حاوی

ہوتے جا رہے تھے۔ مرزا حسین بیگ، آصف اور افضل بیگ کے نام اس کے ہر خط کی آخری سطر پر "سندگان حال کو سلام" کے الفاظ پر ختم ہوتی تھی اور یہ ایک جملہ اس کے نزدیک تمام خط سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔ آصف کو خط کا جواب لکھنے کی عادت نہ تھی لیکن افضل اور حسین بیگ نہایت باقاعدگی کے ساتھ اس کے خطوط کا جواب دیا کرتے تھے حسین بیگ کے خطوط میں ایک پدرانہ شفقت کا اخبار ہوتا۔ افضل کے خطوط بنگال کی سیاسی صورت حالات کے تذکروں سے لبریز ہوتے۔ کبھی کبھی وہ ایک آبدھ فقہ اپنی بہن کے متعلق بھی لکھ دیتا اور معظم علی اس پڑھ کر اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگتا۔ فرحت اچھی سے تمہیں سلام کہتی ہے۔ آج فرحت کہتی تھی کہ تمہاری امی جان بہت مغموم رہتی ہیں، اس لیے تمہیں چند دن کے لیے گھر ضرور آنا چاہیے اور معظم علی کا جی چاہتا کہ وہ اڑ کر مرشد آباد پہنچ جائے اپنی والدہ کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اس کے ذہن میں یہ احساس کارفرما ہوتا کہ وہ اس کی وساطت سے فرحت کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔ معظم علی کی ماں اپنے خطوط میں فرحت کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا کرتی تھی۔ اگر کسی خط میں فرحت کا ذکر نہ ہوتا تو اسے ایک قسم کی تکلیف محسوس ہوتی اور وہ جواب میں شکایت کرتا: امی جان آپ نے مرزا حسین بیگ اور ان کے بال بچوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی اور ماں کی طرف سے اس قسم کا جواب آتا: "بیٹا! میں تمہارا خط ملتے ہی ان کے ہاں لکھی تھی۔ وہ سب بخیریت ہیں۔ فرحت بہت خوش ہے، وہ تمہارے متعلق پوچھتی تھی۔ وہ جب بھی ہمارے یہاں آتی ہے تمہارے متعلق پوچھا کرتی ہے۔ پچھلے دنوں میں ٹیل تھی اور وہ ہر روز میری تیمارداری کے لیے آیا کرتی تھی۔ بڑی نیک لڑکی ہے، وہ پوچھتی تھی کہ تم چند دن کے لیے چھٹی لے کر گھر کیوں نہیں آجاتے؟"

علی دروی خان ایک بیدار مغز حکمران تھا۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں سلطنت

بنگال ایسے سیاسی شاطروں کی آماجگاہ بن چکی تھی جو قوم کی عزت و آزادی کو ہر وقت داؤں پر لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ منہد اقتدار کے یہ بے حیا دعویدار کبھی کسی صوبہ دار یا فوجدار کے ساتھ ساز باز کرتے، اسے علی وردی خان کے مقابلے میں لے آتے اور کبھی مرہٹوں کو بنگال پر حملہ کرنے کے لیے اکساتے۔ علی وردی خاں کے عزیزوں اور رشتہ داروں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی تھی۔ جو بنگال کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے موقع کے انتظار میں رہتے تھے بنگال کے اندر حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار اور فوجی افسر اور بنگال سے باہر مرہٹہ لیڈروں کے لشکر ایسے لوگوں کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوتے۔

یہ وہ دور تھا جب بنگال کی سیاست رائے عامہ کے محاسب سے قطعاً آزاد تھی۔ علی وردی خاں کبھی اپنے گھر کے غداروں سے لڑتا اور کبھی برہمنی حملہ آوروں سے مقابلہ کرتا۔ جب اندرونی بغاوت کا خطرہ پیش آتا تو وہ مرہٹوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہوتا اور جب مرہٹے دوستی کے تمام معاہدے توڑ کر بنگال کے حدود میں آگھستے تو وہ شکست خوردہ غداروں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی بجائے اٹھا کر گلے لگانے کی ضرورت محسوس کرتا۔

علی وردی خاں کو اس لحاظ سے کامیاب سیاست دان کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے حریفوں کے درمیان ایسا توازن قائم رکھا کہ وہ ایک متحدہ محاذ بنا کر اس کے اقتدار پر فیصلہ کن ضرب نہ لگا سکے۔ لیکن اپنے تدبیر و ذہانت اور موقع شناسی کے باوجود وہ ان فتنوں کا سد باب نہ کر سکا جو بالآخر اس کے جانشین نواب سراج الدولہ کی شکست اور بنگال کی تباہی کا باعث ہوئے۔ اس کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ وہ برہمنی خطرات کے مقابلے کے لیے ملک کے عوام کا مدافعتی شعور اور اندرونی غداروں کے خلاف قوم کی قوت محاسبہ بیدار نہ کر سکا۔

علی وردی خاں کے دربار میں میر جعفر کے مروج کے ساتھ بنگال کی تباہی کے اسباب مکمل جو پکے تھے۔ وہ ان قسم کے آزماؤں سے کہیں زیادہ دور اندیش تھا۔ جو سلطنت کے عہدیداروں

کے گٹھ جوڑ یا مرہٹوں کے تعاون سے بنگال کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، اور اس کی دلہنیشی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنا مستقبل ان انگریز تاجروں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ جو فورٹ ولیم میں بیٹھ کر نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔

میر جعفر کا طریق کار ان طالع آزمائوں سے مختلف تھا جو کھلے بندوں علی وردی خاں کے ساتھ قوت آزمائی کر کے اپنی شکست یا تباہی کا خطرہ مول لیتے تھے۔ وہ درپردہ ان تمام بغاوتوں اور سازشوں میں شریک تھا جو بتدریج بنگال کی قوت مدافعت کو مفلوج کر کے انگریزوں کے لیے راستہ صاف کر رہی تھیں۔

یہ بعد دیگرے بنگال کے امراء کی بغاوتوں نے اس کی کامیابی کے راستے صاف کر دیئے۔ علی وردی خاں جو عام حالات میں میر جعفر کو اپنا ایک حقیر ساتھی سمجھتا تھا، یہاں تک مجبور ہو گیا کہ اسے قابل اعتماد دوست سمجھنے لگا اور یہ ایک حقیقت پسند انسان کی مجبوری نہ تھی بلکہ اس سیاست دان کی مجبوری تھی جو برائیوں کو ختم کرنے سے ناامید ہو کر ان سے اچھے نتائج پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میر جعفر، اڑیسہ کا نائب صوبیدار مقرر ہوا تو مرشد آباد کے امراء جو اسے ہمیشہ قابل نفرت سمجھتے تھے، چونکہ اٹھے، لیکن اس نے جلد ہی ایک اور کامیابی حاصل کی یعنی ہنگلی اور میدناپور کی فوجدار بھی حاصل کر لی، جو سکتا ہے کہ دربار میں اپنے ایک رشتہ دار کی سازشوں سے تنگ آکر علی وردی خاں نے اسے مرشد آباد سے دور بھیجنا مناسب خیال کیا ہو۔ لیکن بنگال کے سن رسیدہ حکمران کو کیا معلوم تھا کہ ہنگلی میں ایک فوجدار کی حیثیت سے میر جعفر کا اثر و رسوخ بنگال کے لیے بلا فائدہ تباہ کن ثابت ہو گا۔ ہنگلی اور میدناپور میں علی وردی خاں کی لگاؤوں سے دور رہ کر وہ زیادہ آزادی کے ساتھ انگریزوں کی سازشوں میں شریک ہو سکتا تھا۔

”معلم! ماں کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کی تمام حیات محنت کرائی گئی۔ کچھ دیر یہ تینوں سکے کے عالم میں کھڑی رہیں۔

معلم علی گھوڑے سے اترا اور اسلام علیکم کہہ کر چند قدم آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں فرحت جس کے چہرے پر اب تک کئی رنگ آپکے تھے۔ اپنی ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”معلم! معلم!!“ ماں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو پھوٹ نکلے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر معلم علی کا سراپے سینے سے لگایا اور کہا ”بیٹا! یہ تمہاری چچی جان ہیں!“

حسین بیگ کی بیوی کی آنکھوں میں بھی آنسو جمع ہو رہے تھے۔ اس نے مڑ کر فرحت کی طرف دیکھا اور کہا: ”بیٹی تم گھر جاؤ اور اپنے آبا سے کہو معلم علی آگیا ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

فرحت اپنا چہرہ چادر میں چھپائے ہوئے جھپکتی اور نمٹی دروازے کی طرف بڑھی۔ معلم علی نے کہا: ”چچی جان آپ کے گھر میں خیریت ہے نا؟“

فرحت کی ماں نے جواب دیا: ”گھر میں سب خیریت ہے بیٹا، لیکن تم نے ہم کو بہت پریشان کیا۔“

”صابر! صابر!“ معلم علی کی ماں نے نوکر کو آواز دی۔ صابر نکلیں ملتا ہوا اہطل کے قریب کے کمرے سے باہر نکلا اور خواتین کی موجودگی کا خیال کیے بغیر جھگٹا ہوا معلم علی کے ساتھ پلٹ گیا۔

معلم علی کی ماں نے مسرت سے ہوتے کہا: ”صابر! معلم کا گھوڑا اہطل میں باندھ دو اور اس کے ابا جان اور یوسف کو اس کے آنے کی اطلاع کر دو۔“

معلم علی نے کہا: ”نہیں امی جان! گھوڑا باندھنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی مجھے باہر کچھ کام ہے۔“

اڈیسہ پر مرہٹوں اور افغانوں کے متحدہ حملے کی خبریں مشہور رہی تھیں۔ ایک دن مرشد آباد کے پریشان حال لوگوں نے یہ سنا کہ جگلی سے میر جعفر کی کمان میں سات ہزار سوار اور بارہ ہزار پیادہ فوج کٹک کا رخ کر رہی ہے۔ پھر کوئی ایک مہفتہ بعد یہ اطلاع آئی کہ میر جعفر دشمن کو شکست دینے کے بعد ان کا تعاقب کر رہا ہے۔

پھر جب مرشد آباد میں فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں، یہ خبر آئی کہ احمد اوروں کی مدد کے لیے رانگھوجی کا بیٹا جانوجی ایک بڑی دل فشکر کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے اور میر جعفر اس کا سامنا کرنے کی بجائے اسے پاؤں بردوان کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اس کے بعد کئی دن تک اڈیسہ کے طول وعرض میں مرہٹوں اور افغانوں کی ٹوٹ مادی خبریں آتی رہیں۔ معلم علی کے دوست اور عزیز ان خبروں سے بہت پریشان تھے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ دور افتادہ سرحدی قلعے کا یہ محافظ کس حال میں ہے۔ ہر ذرا حسین بیگ ہر روز سپہ سالار کے پاس جاتا اور معلم علی کے متعلق پوچھتا لیکن کئی دن تک وہ اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ فرحت اور اس کی والدہ صبح شام معلم علی کے گھر جاتیں اور اس کی ماں کو تسلی دینے کی کوشش کرتیں۔

چند دن بعد کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ مرہٹوں نے سرحدی قلعہ فتح کر لیا ہے معلم علی کے بیشتر ساتھی شہید ہو چکے ہیں اور باقی دشمن کی قید میں ہیں اور اس قسم کی افواہوں کے ساتھ معلم علی کی بہادرانہ موت کی فرضی داستانیں مشہور ہونے لگیں۔

ایک دن فرحت اور اس کی والدہ حسب معمول معلم علی کے گھر گئیں۔ کچھ دیر معلم علی کی ماں کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد انھوں نے رخصت چاہی۔ معلم علی کی ماں انھیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔ وہ زانہ خانے سے نکل کر مکان کے مردانہ حصے کے صحن میں داخل ہو رہی تھیں کہ گلی کی طرف سے ایک سوار اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

تم اگر دشمن کا محاصرہ توڑ کر نکل سکتے ہو تو بردوان پہنچ جاؤ۔
اگر یہی حکم ہمیں آٹھ دس دن پہلے مل جاتا تو اتنی جانیں ضائع نہ ہوتیں۔ میر جعفر کی اہلیت
اور بزدلی کے باعث ہمارے ہاتھ سے صرف ایک قلعہ ہی نہیں نکلا بلکہ اڑیسہ کے تمام علاقوں
کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور اگر حکومت نے کچھ عرصہ اور اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں سے
فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے یقین ہے کہ پورا جنگل مرہٹوں کی تشنگانہ بن جائے گا۔
آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان حالات میں بھی مجھے میر جعفر سے چند منٹ کی ملاقات
کے لیے دودن بردوان میں ٹھہرنا پڑا۔

”تم میر جعفر سے مل کر آئے ہو؟“

ہاں اردو دن تک اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں زبردستی مل کے ابھر گھر

گیا اور سپاہی مجھے پوچھ کر اس کے پاس لے گئے تھے۔

میرمدن نے کہا: ”جعفر اپنی تمام برائیوں کے باوجود جنگل کے حکمران کا رشتہ دار

ہے۔ تم نے اس کے ساتھ کوئی گستاخی تو نہیں کی؟“

معظم علی نے جواب دیا: اگر کسی بزدل آدمی کو بزدل مٹا گستاخی ہے تو میں اس جرم

کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ میں علی درودی خاں نے بھی یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ میر جعفر

ان کا رشتہ دار ہونے کے باوجود اس قابض کے لیے فوج میں کوئی معمولی عمدہ بھی نیا جاسکتا

میرمدن نے چند ثانیے مر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: ”معظم علی: میں بھی ایک سپاہی ہوں

اور موجودہ حالات میں تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔ میر جعفر کے متعلق میرے خیالات تھکے

خیالات سے مختلف نہیں لیکن علی درودی خاں کے سامنے اس کی شکایت کرنے سے کوئی فائدہ

نہیں ہوگا۔ جب اسے میدان پورا اور ہنگامی کی فوجی دی جا رہی تھی تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی

میں نے علی درودی خاں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مرہٹوں کے خلاف فوج کی کمان کے لیے اس کا انتخاب

درست نہیں۔ لیکن میری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھیں میر جعفر کی صلاحیتوں کے متعلق

ذہن کی ماں نے کہا: بیٹا کہاں جا رہے ہو! آرام سے گھر بیٹھو، تمہارے چہرے سے
معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کئی دن سے آرام نہیں کیا ہے۔“

معظم علی نے کلمہ چھی جان! میں میرمدن کے پاس جا رہا ہوں اور ان سے ملاقات کے
بعد شاید مجھے نواب صاحب کے سامنے حاضر ہونا پڑے۔ مجھے سیدھا وہاں جانا چاہیے تھا۔
لیکن میں نے سوچا کہ پہلے گھر کا حال معلوم کروں۔



کوئی ایک گھنٹہ بعد معظم علی میرمدن کے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔
میرمدن نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے ساتھ گرجوشتی سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے سامنے
بٹھانے کے بعد کہا: ”معظم علی! میں کسی تہدید کے بغیر تمہارے ساتھیوں کے متعلق جاننا چاہتا ہوں
معظم علی نے منہم لہجے میں جواب دیا: میرے ساتھی میر جعفر کی بزدلی اور بے غیرتی
کا کفارہ ادا کر چکے ہیں اوریں مرشد آباد کی ماؤں اور بہنوں کے لیے یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ حکومت
کی بے حسی اور نااہلیت کے باعث ان کے تین سو بیٹے، بھائی اور شوہر ہلاک ہو چکے ہیں۔“
”اور باقی؟“ میرمدن نے تھکے وقت کے بعد سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا: چالیس سپاہی دشمن کی قید میں ہیں اور باقی ایک سو ساٹھ جن
میں سے قریباً پچاس زخمی ہیں۔ قلعے سے بچ کر نکل آئے تھے۔ میں انہیں بردوان کے راستے
میں ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ہم نے دشمن کے ہاتھوں شکست
نہیں کھائی۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حکومت نے ہمیں بے دست و پا بنا کر دشمن کے آگے
ڈال دیا تھا۔ ہم نے پندرہ دن تک دشمن کے اس لشکر کا مقابلہ کیا جو تعداد میں ہم سے بیس گنا
زیادہ تھا اور ہمیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ دن کے اندر کمک پہنچ جائے گی۔ میں بردور
میر جعفر کے پاس پیغام بھیجتا تھا کہ جہاں بارود ختم ہو رہا ہے اور ہم زیادہ دیر تک دشمن کا مقابلہ
نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمیں پندرہ دن کے بعد یہ جواب ملا کہ اس قلعے کی حفاظت بے سود ہے

شاہی محل کے اندر اور باہر اس کے جاسوس بروقت چوکس رہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ تمہارے مرشد آباد پہنچنے سے پہلے تمہارے متعلق اس کی ہدایات ان کے پاس پہنچ چکی ہوں گی۔ اب میرے ساتھ ملاقات کے بعد تم اگر علی دردی خاں کے پاس جا کر میری جھجکی شکایت کرو گے، تو ایسے لوگ انہیں فرارِ جزا کریں گے کہ تم میری طرف سے آئے ہو۔

معظم علی نے بدل ہو کر کہا: مجھے معلوم نہ تھا کہ میری جھجک کے سامنے آپ بھی بے بس ہو چکے ہیں۔

میرمدن نے جواب دیا: معظم علی! ہم نے بڑے حالات میں جہم لیا ہے۔ لیکن کاش ہم تمام برائیوں کے خلاف لڑ سکتے۔ موجودہ حالات میں نواب علی دردی خاں بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بیک وقت ہر برائی کے خلاف نہیں لڑ سکتے وہ ایک بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے خطرات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس وقت ان کی ساری توجہ مرہٹوں پر مرکوز ہے۔ میرے مشورہ پر اب انہوں نے اڑیسہ کی ہم میری جھجکی جگہ عطاء اللہ خاں کو سونپ دی ہے۔ وہ دن تک یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ آج تیسرے پہر علی دردی خاں نے فوج کے چند افراد کا اجلاس طلب کیا ہے۔ اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم میری جھجک کے خلاف اپنے جذبات پر قابو رکھو گے تو میں یہ کوشش کروں گا کہ اس اجلاس میں تمہیں بھی بلایا جائے۔ تم تمام حالات سے واقف ہو اور اس اجلاس میں میری جھجکی ذات کے متعلق کچھ بغیر تمہیں پوری آزادی سے ان غلطیوں پر کھینچ کر لے کر لے کر اجازت ہو گی جن کے باعث یہ حالات پیدا ہوئے ہیں۔ میری جھجکی اتحاد پسپائی کے متعلق ایک ہفتہ قبل میرے دربار میں کافی نے دے چکی ہے اور تم اس کی ذات کو ہر لحاظ سے بنا کر علی دردی خاں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر سکو گے۔ لیکن اگر تم گذشتہ کوآہوں کی تلافی کے لیے کوئی مفید تجویز پیش کر سکو تو ممکن ہے کہ اڑیسہ کے حالات کے رویہ اصلاح ہوتے ہی وہ وقت بہت جلد آجائے۔ اب ہر اطمینان سے میری جھجک کے قماش کے لوگوں پر توجہ دے سکیں۔

معظم علی نے کہا: میری پہلی تجویز یہ ہو گی کہ مرہٹوں سے جنگ کے دوران میں میری جھجک

کوئی غلط فہمی نہیں لیکن بڑے بڑے امراء کی بغاوتوں نے انہیں میری جھجک جیسے خوشامدوں کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ تم ان کے سامنے اس میری جھجکی شکایت کرو گے جس کی نا اہلیت اور بزدلی کے باعث اڑیسہ کے عوام تباہی کا سامنا کر رہے ہیں۔ لیکن میری جھجک ان کے سامنے پیش ہوگا تو انتہائی سختی کی حالت میں بھی بنگال کے حکمران کا معاملہ اس شخص کیسے ہوگا جو بوقتِ ضرورت اپنے آقا کے قدموں پر گرنا جانتا ہے، وہ کہے گا: عاںیہا! میں آپ کا حقیر غلام ہوں۔ میں خطاؤں کا پتلا ہوں۔ میری تقریر معاف کیجئے۔ اور علی دردی خاں اگر اس کے الفاظ سے نہیں تو اس کے آنسوؤں سے مزبور متاثر ہوگا اور جب میری جھجک دیکھے گا کہ اس کے آنسو بھی رنگان گئے ہیں تو وہ محل کی بیگمات کے پاس جائے گا اور ان سے کہے گا کہ نواب صاحب میرے دشمنوں کی باتوں میں آگئے ہیں۔ میں مظلوم ہوں۔ میں بے گناہ ہوں۔ خدا کے لیے میری سفارش کیجئے۔ سلطنت کے دشمن یہ نہیں چاہتے کہ یہ وفادار غلام نواب صاحب کے قدموں میں رہے۔ اور پھر چند دن بعد نواب صاحب اسے ہلا کر یہ کہیں گے: میری جھجک! ہم تمہاری سابقہ فرنگہ داشتیں معاف کرتے ہیں۔ لیکن آئندہ کے لیے عطا دیو۔ ہمیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیئے۔ اور وہ یہ کہے گا: عالی جاہ! مجھے جاہ و منصب کا شوق نہیں۔ مجھے کم از کم اس وقت تک اپنی خدمت کا موقع دیکھئے، جب تک سراج الدولہ سلطنت کے کالبد میں آپ کا ہاتھ بٹانے کے قابل نہیں ہو جاتا اور ایسے امراء بنگال سے ختم نہیں ہو جاتے جو آئے دن آپ کی حکومت کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ معظم علی! مجھے اندیشہ ہے کہ تم نے بردوان میں میری جھجک سے یہ ضرور کہا ہوگا کہ علی دردی خاں کے پاس جا کر اس کی شکایت کرو گے اور مجھے یقین ہے کہ تم سے پہلے میری جھجک کے جاسوس، علی دردی خاں کو اس کا یہ پیغام پہنچا چکے ہوں گے کہ ایک سرسبز جوان شاید آپ کے پاس پہنچ کر میری شکایت کرنے میں مجھے یقین ہے کہ آپ سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے مجھے صفائی کا موقع دیں گے اور یہ جوان آپ کے متعلق بھی نہایت باغیانہ خیالات کا اظہار کر چکا ہے۔ مرشد آباد میں

بیسے لوگوں کو فوجی معاملات میں مداخلت سے باز رکھا جائے
میرمدن مسکرایا: "تھیں یہ تجویز پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی میرے جعفر کو یہ ہدایات بھیجی
جا چکی ہیں کہ عطاء اللہ خاں کے ساتھ پورا تعاون کرے اور عطاء اللہ خاں کو یہ اختیار دیا جا چکا ہے
کہ اگر وہ کسی افسر سے ملنے نہ ہو تو اسے سبکدوش کر دے۔"
معظم علی نے کہا: "جب مرہٹے ہمارے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور مجھے کئی دن تک
میر جعفر کی طرف سے اپنے پیغامات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا تو میں نے یہ عہد کیا تھا کہ جنگ
ختم ہوتے ہی میں فوج کی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ لیکن جب میں اپنے ساتھیوں کی
بے گور و کمن لاشیں چھوڑ کر وہاں سے نکلے لگا تو میں نے یہ عہد کیا کہ میں کم از کم ایک بار اور
یہاں ضرور آؤں گا۔ میں عطاء اللہ خاں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن اگر آپ کو اس کی صلاحیتوں
پر اعتماد ہے تو میں یہ درخواست کروں گا کہ مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا جائے۔"
میرمدن نے کہا: "لیکن میرا خیال تھا تم اتنی مدت کے بعد چند دن مرشد آباد رہنا چاہو گے۔"
معظم علی نے جواب دیا: "وہ قلعہ جہاں میرے ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ مجھے
مرشد آباد سے زیادہ عزیز ہے۔"



میرمدن سے ملاقات کے بعد معظم علی واپس گھر پہنچا تو اس کا باپ، بھائی اور حسین بیگ
دیوان خانے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ محلے کے پندرہ بیس آدمی اور بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے
وہ سب باری باری اظہار اس سے نقل گیر ہوئے۔
مرزا حسین بیگ نے معظم علی کو اپنے قریب بٹھالیا اور کہا: "بیٹا! ہم بڑی دیر سے تمہارا انتظار
کر رہے ہیں اور تمہاری زبان سے اڑلیکے حالات سننے کے لیے بے چین ہیں چند دنوں سے
سرحدی علاقوں کے متعلق بہت بری خبریں آرہی تھیں اور ہم تمہارے متعلق بہت پریشان تھے۔
میں تمام واقعات سناؤ۔"

معظم علی نے اس کے جواب میں میر جعفر کی نااہلیت، مرہٹوں کے مظالم اور سرحدی
قلعے کی تباہی کی داستان مختصراً بیان کر دی۔
اتنی دیر میں محلے کے بڑے بچے اور جوان جوق در جوق مکان کے اندر داخل ہوئے
تھے اور صابر بلند آواز سے چلا رہا تھا: "بھئی ٹھہرو! اندر جگہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے شور نہ مچاؤ
اندر مرزا صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔"

معظم علی جلدی سے اٹھ کر باہر نکلا اور لوگ دیوار دار آگے بڑھ کر اس کے ساتھ
بنگیا ہوئے اور مصافحہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ محمود علی، حسین بیگ اور محلے کے
باقی معززین بھی کمرے سے نکل کر باہر آگئے اور براہمدے میں کھڑے ہو کر یہ فتنہ دیکھنے لگے۔
جب معظم علی صحن میں جمع ہونے والے لوگوں سے ملنے کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچا تو باہر
لگی میں ایک اور ہجوم دکھائی دیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک وہ ان لوگوں سے ملنے میں مصروف رہا۔
اتنی دیر میں آصف بیگ اور افضل بیگ بھی آگئے، وہ معظم علی کو دیکھتے ہی جوم کو
چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محلے کے باقی لوگ
رخصت ہو چکے تھے اور معظم علی دیوان خانے کی بجائے بالائی منزل کے ایک کمرے میں اپنے
عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

اگلے دن سارے محلے میں یہ خبر مشہور ہو چکی تھی کہ معظم علی، عطاء اللہ خاں کے ساتھ اڑلیکے
کی ہم پر جارہا ہے اس کے بھائی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹوں نے بھی اس ہم کے لیے اپنے
نام پیش کیے تھے۔ لیکن مرشد آباد کے قہدار نے صرف آصف بیگ کو معظم علی کا ساتھ دینے کی
اجازت دی ہے۔

تیسرے دن مرزا حسین بیگ کے ہاں معظم علی کی دعوت تھی، جس میں مرشد آباد کے قریب
ساتھ املا اور بڑے بڑے افسر مدعو تھے۔ گیارہ بجے کے قریب مرزا حسین بیگ محلے کے چند
معززین کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد مرشد آباد کے محل کے اندر پہنچے اور اس کے نیچے جمع

اُترتے ہی سیدھا سپہ سالار کے نیچے میں پہنچا۔

عطار اللہ خاں اپنے کاتب سے کوئی مراسلہ کھوارا دیا تھا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھتے ہی کہا: میں دودن سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تم نے بہت دیر لگائی!

معظم علی نے جواب دیا میں مرہٹوں کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا تھا۔ اب شمال کے تمام جنگلات ان کے وجود سے پاک ہو چکے ہیں۔ پھر بھی اگر پانچ سو قیدیوں کو ساتھ لائے گا مسئلہ جوتا تو میں دودن قبل یہاں پہنچ جاتا۔ قیدیوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ سرحدی قلعے میں اس وقت مرہٹوں کے صرف ایک ہزار سپاہی موجود ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کسی تاجر کے بغیر قلعے پر حملہ کر دیا جائے!

عطار اللہ خاں نے جواب دیا: قلعے پر حملہ کرنے کے لیے تمہیں چند دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ کل مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ یہاں سے چالیس میل دور شمال مغرب کی طرف مرہٹوں کا ایک لشکر جنگل میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور میں آج علی الصباح میر جعفر کی قیادت میں پانچ ہزار سواروں کو اس طرف روانہ کر چکا ہوں۔

معظم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا: میر جعفر کو ایسی مہم پر بھیجنے سے پہلے اگر آپ دشمن کو غیر مسلح کر کے درختوں کے ساتھ باندھ دیتے تو شاید یہ مہم کامیاب رہتی۔

عطار اللہ خاں نے جواب دیا: میر جعفر اس مہم پر جانے کے لیے مصر تھا اور میں اسے گذشتہ بنامی کا داغ دھونے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ تمہارا دوست آصف بیگ میر جعفر کے ساتھ جا چکا ہے اور مجھے میر جعفر سے زیادہ اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔ میں اس مہم پر تمہیں بھیجنا چاہتا تھا لیکن تم دیر سے پہنچے ہو۔

معظم علی نے کہا: میر جعفر کی رفاقت کے لیے آصف بیگ جیسے جری فوجوان کا انتخاب صحیح نہیں تھا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس مہم پر جانے کی اجازت دی جائے اور میرا ارادہ ہے کہ اس مہم سے فارغ ہو کر واپس آنے کی بجائے سرحدی قلعے پر حملہ کر دیا جائے۔

ہونے والے مہمانوں کی نگاہیں اندرون صحن کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک فوجی لڑکا جس کے دائیں بائیں میرمدن، راجہ رام موہن لال، عطار اللہ خاں اور مرشد آباد کے فوجدار تھے۔ دروازے سے نمودار ہوا۔ ان کے پیچھے مرزا حسین بیگ اور محلے کے چند اور معززین تھے۔ فوج خوش وضع لڑکا جس کی تباہیروں سے مرتعہ تھی، ایک شاہانہ تکنت کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور سائبان کے نیچے براہونے والے مہمان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ لکھنؤ کا سلطنت بنگال کا دلی مہر سراج الدولہ تھا۔ وہ کسی کے ساتھ بے تکلفی سے مصافحہ کرتا اور کسی کو ہاتھ کے اشارے یا مسکراہٹ کے ساتھ سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھا اور دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے دولٹاں میں مہمان سراج الدولہ کے بعد جس شخص کی طرف سب سے زیادہ دیکھ رہے تھے وہ معظم علی تھا جو اس کے بائیں ہاتھ عطار اللہ خاں اور حسین بیگ کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حسین بیگ اٹھا اور اس نے ایک مختصر سی تقریر میں سراج الدولہ، میرمدن اور دوسرے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

سراج الدولہ نے اس کی تقریر کے جواب میں کہا: اس وقت ہم سب کو معظم علی کا شکر گزار ہونا چاہیے جس کی خاطر اس شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے، ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں اس فوجانہ کی موت افزائی کا موقع لا جاؤں جس نے بنگال کی فوج کے لیے جرات، ہمت، بہادری اور وفاداری کی قابل فخر مثال قائم کی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ جب اڑیسہ کی مہم سے مرشد آباد کی فوج واپس آئے تو مرزا صاحب اس طرح کی کئی اور دعوتوں کی ضرورت محسوس کریں۔

بنگال کی فوج اڑیسہ میں مرہٹوں پر بے شکستیاں دینے کے بعد انہیں مغرب کی طرف دھکیں رہی تھی۔ سرحد سے پچاس میل کے فاصلے پر عطار اللہ خاں کی فوجیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ ایک شام معظم علی ایک ہزار سواروں کے ساتھ پڑاؤ میں داخل ہوا اور چوڑے سے

کر رہی تھیں۔ وہ گھوڑا بھگاتا ہوا سپاہیوں کی ایک ٹولی کے قریب پہنچا۔ ایک فوجان افسر نے اگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔ معظ علی نے کسی توقف کے بغیر سوال کیا: تم نے رات کے وقت یہاں پناؤ ڈالا تھا؟

جی ہاں۔

فوج کو یہاں سے روانہ ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ۔

رات کے وقت دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق کوئی اطلاع ملی تھی؟

جی ہاں! رات کے وقت ہمیں پتہ چلا تھا کہ دشمن یہاں سے کوئی تین کوس کے فاصلے پر پناؤ ڈالے ہوئے ہے۔

اور وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے ہیں؟

جی ہاں! اس سلسلے پر کافی بحث ہوئی تھی کہ جنگل میں فوج کو اس سے اگے پیدل پیچھڑی کرنی چاہیے یا گھوڑوں پر۔ اھٹ بیگم کا خیال تھا کہ فوج کو اس سے اگے پیدل جانا چاہیے لیکن میر جعفر یہ کہتے تھے کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

معظ علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا: میر جعفر یہ سمجھتے ہیں کہ بھاگنے کے لیے پاؤں کی بجائے گھوڑے زیادہ کام دیتے ہیں۔ پھر وہ اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا: تم میں سے کچھ اس آدمی میرے ساتھ پیدل ملیں اور دوسروں کی طرف متوجہ ہوں۔ تم میں سے کچھ اس آدمی میں۔ باقی تمام گھوڑوں کو لے کر ان ٹیلوں کے پیچھے چھپ جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ میر جعفر دشمن کو بہت جلد یہاں لے آئیں گے۔

پھر وہ پناؤ کے محافظ کی طرف متوجہ ہوا: میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم یہاں سے یہ خیمے اکھٹا کر اور درمیان درمی سامان ان ٹیلوں کے پیچھے لے جاؤ۔

فوجان افسر نے گہرا کر کہا: لیکن جناب! میر جعفر کے حکم کے بغیر۔۔۔۔۔

عطار اللہ خاں نے جواب دیا: اگر تمہیں میر جعفر کی کمان میں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تو میں غرضی سے تمہاری درخواست منظور کرتا ہوں۔

معظ علی نے کہا: میں ایک سپاہی ہوں اور اگر میر جعفر نے کوئی بہت بڑی حماقت نہ کی تو ہمارے درمیان کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

عطار اللہ خاں نے ایک نقشہ اٹھا کر کھولتے ہوئے کہا: بیٹھ جاؤ۔

معظ علی اس کے سامنے بیٹھ گیا اور عطار اللہ خاں نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا: یہ سر ہٹوں کا پڑاؤ ہے۔ اور میں نے میر جعفر کو یہ راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ کل طلوع آفتاب سے پہلے وہ دشمن پر حملہ کرنے گا۔ میرے خیال میں تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں تازہ دم سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ میں تمہارے لیے پانچ سو سواروں کو تیار کر کے لایا ہوں۔ اتنی دیر میں تم اپنی رہنمائی کے لیے اس نقشے کی نقل تیار کرو۔

معظ علی نے جواب دیا: یہ نقشہ مجھے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ یہ دیکھتے مرہٹوں کے پڑاؤ سے صرف تیس میل دور وہ قلعہ ہے۔ جہاں میں کئی برس گزار چکا ہوں۔ ان جنگلوں میں میں نے بار بار مرہٹوں کا تعاقب کیا ہے۔ مرہٹوں کے پڑاؤ کے آس پاس کے ٹیلے وادیاں اور ندیاں اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مجھے صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ میں شاید حملے سے پہلے نہ پہنچ سکوں۔

عطار اللہ خاں نے کہا: مجھے یقین ہے کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گے۔

معظ علی پر سالار کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا اور قریباً نصف گھنٹہ بعد اس کی قیادت میں پانچ سو سوار شمال مغرب کا رخ کر رہے تھے۔

○

اگلی صبح چند ٹیلے عبور کرنے کے بعد معظ علی کو اپنے سامنے ایک ندی کے کنارے خیموں کی ایک قطار دکھائی دی۔ مسلح سپاہیوں کی چند ٹولیاں ان خیموں کے درمیان ادھر ادھر گشت

معظم علی نے چلا کر کہا: "لیکن تم بھاگ کیوں رہے ہو؟"

"یہ میر جعفر کا حکم ہے۔"

"مرزا آصف بیگ کہاں ہے؟"

"وہ حملے کے وقت اپنی ایک ہزار فوج کے ساتھ گھوڑوں سے اتر کر جنگل میں گھس گیا تھا۔"

اور اب معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا؟ میر جعفر اس سے بہت خفا ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "اگر آصف کے ایک ہزار جانباڑ ابھی تک جنگل میں ہیں تو مرہٹے کھلے میدان میں تم سے لڑنے کے لیے نہیں آئیں گے۔ تم تمام سواروں کو اس جگہ روکنے کی کوشش کرو، میں جرابی حملہ کرنا چاہتا ہوں!"

افسر نے جواب دیا: "لیکن میر جعفر اسے حکم عدلی سمجھیں گے۔"

معظم علی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا: "میر جعفر مرشد آباد پہنچنے سے پہلے دم نہیں لیں گے اور تم اس وقت میری کمان میں ہو۔ اگر کسی سوار نے آگے جانے کی کوشش کی تو میں اپنے سپاہیوں کو حکم دوں گا کہ وہ اسے بلا توقف گولی مار دیں۔"

افسر نے کہا: "اگر آپ یہ ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو میں بھاگنے کی بجائے آپ کی فائز میں جان دینا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔"

اتنی دیر میں کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پسپا کر دیے گئے۔

وہاں سے واپس آئے اور کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پسپا کر دیے گئے۔

وہاں سے واپس آئے اور کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پسپا کر دیے گئے۔

وہاں سے واپس آئے اور کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پسپا کر دیے گئے۔

وہاں سے واپس آئے اور کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پسپا کر دیے گئے۔

وہاں سے واپس آئے اور کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پسپا کر دیے گئے۔

وہاں سے واپس آئے اور کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پسپا کر دیے گئے۔

وہاں سے واپس آئے اور کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پسپا کر دیے گئے۔

معظم علی نے جھنجھلا کر کہا: "اگر تم نے رات کے وقت اس جگہ پڑاؤ ڈالا تو مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر بعد میر جعفر کو حکم دینے کا ہوش نہیں ہوگا اور میں اس کے سامنے تمہیں حکم عدلی کی سزا دے سکوں گا۔"

"لیکن جناب میں نے کوئی حکم عدلی نہیں کی۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ میر جعفر۔"

معظم علی نے اس کی بات کا سہہ بولے کہا: "تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں دس منٹ کے بعد اس جگہ پڑاؤ کا کوئی نشان نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"بہت اچھا جناب!"

اچانک جنگل میں دور سے بندوقوں کے دھماکے سنائی دیئے اور معظم علی نے گھوڑے سے کود کر اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے کہا: "بہادور! جلدی کرو، میر جعفر میری توقع سے پہلے واپس تشریف لا رہے ہیں۔"

پچاس سپاہی گھوڑوں سے اتر کر معظم علی کے پیچھے ندی میں گھس پڑے اور گھٹنے گھٹنے پانی میں سے گزرنے کے بعد جنگل میں غائب ہو گئے۔ کوئی ایک میل جنگل میں چلنے کے بعد انہیں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ مسلم علی نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور وہ اس کے دائیں بائیں بکھر کر درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ چند منٹ بعد بنگال کی فوج کے چند سوار دکھائی دیئے جن میں سے ایک میر جعفر تھا۔

"ٹھہریے! ٹھہریے!!" معظم علی نے دونوں ہاتھ بند کر کے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ درختوں اور جھاڑیوں سے بچتے ہوئے نکل گئے۔ پھر چند دسے نوادار ہوئے۔ ایک افسر نے معظم علی کو دیکھ کر اپنا گھوڑا روکا اور معظم علی نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے سوال کیا: "کیا جو تم کیوں بھاگ رہے ہو؟"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ جمادی بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آچکی ہے۔"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ جمادی بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آچکی ہے۔"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ جمادی بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آچکی ہے۔"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ جمادی بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آچکی ہے۔"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ جمادی بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آچکی ہے۔"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ جمادی بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آچکی ہے۔"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ جمادی بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آچکی ہے۔"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ جمادی بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آچکی ہے۔"

معظم علی کو سامنے ایک چھڑا سا ٹیلہ دکھائی دیا۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ بھاگتا ہوا ٹیلے کے جنوب کی طرف ایک چھوٹی سی جھیل دکھائی دی جس کے کناروں پر آصف بیگ کے سپاہی اور مرہٹوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ان کی آن میں وہ ٹیلے سے نیچے اتر کر اپنی فوج کو نئی ہدایات دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جنگال کا لشکر دائیں اور بائیں طرف سے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر جھیل کے گہ گہر اڈالنے کے بعد مرہٹوں پر حملہ کر چکا تھا۔ مرہٹوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد تھی۔ لیکن ان کے لیے یہ حملہ جس قدر شدید تھا۔ اسی قدر غیر متوقع تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد معظم علی کے سپاہی جھیل کے ارد گرد دشمن کی لاشوں کے انبار لگا چکے تھے اور مرہٹے انتہائی مراسی کی حالت میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

قریباً چالیس منٹ کے بعد میدان صاف ہو چکا تھا۔ شکست خوردہ دشمن کے کوئی ڈیڑھ سو آدمی جو بدحواسی کی حالت میں جھیل میں کودنے کے بعد ایک جھوٹے سے ٹاپو پر جمع ہو گئے تھے۔ ڈال چکے تھے۔ جنگال کے ڈیڑھ سو سپاہی زخمی اور اتنی شہید ہوئے۔ آصف بیگ جس کا جسم زخموں سے چھلنی تھا۔ جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے پڑا کراہ رہا تھا۔ چند سپاہی اور انہیں اس کے گرد کھڑے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا پیچھا اور آصف کے قریب بیٹھ گیا۔ آصف نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

”دوست قہر دار میرے آئے۔“

معظم علی نے ارد گرد کھڑے ہونے والے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: جراح کو بلاؤ۔ جلدی کرو!“

آصف بیگ نے دُوبتی ہوئی آواز میں کہا: جراح کی ضرورت نہیں! تم اطمینان سے میرے ساتھ باتیں کرتے رہو۔ میں تم سے بہت کچھ کنا جانتا ہوں۔ مجھے تمہارے یہاں آنے کی توقع تھی۔ ادیں تھوڑی دیر پہلے یہ سوچ رہا تھا کہ کئی باتیں ایسی تھیں جو میں تم سے نہیں کہہ

سکا۔ پھر اس نے ارد گرد جمع ہونے والوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ادھر ادھر بٹ گئے۔

”معظم علی! آصف نے قہر سے وقف کے بعد کہا: مجھے اسی جگہ دفن کر دینا اور ابا جان سے یہ کنا کر میں نے تمام زخم سینے پر کھائے تھے۔ افضل کو میری طرف سے نصیحت کرنا کہ وہ کبھی کسی بزدل آدمی کی قیادت میں لڑنے کی غلطی نہ کرے۔ میں اپنی فوج کے سپاہی تھیں سوچتا ہوں۔ اور میرے جو ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔ ان کے لواحقین کے لیے حکومت سے اعانت حاصل کرنا تمہارا فرض ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم کسی دن اڑلیہ کے گورنر بنو اور پھر میری قبر پر اگر یہ کہو: آصف! میں تمہیں بھولا نہیں۔ ابا جان کی یہ خواہش تھی کہ اس ہم سے فارغ ہونے کے بعد میری شادی کر دی جائے۔ رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ آج ہی ڈھاکہ کے کسی ادبچے گھرانے سے میرے لیے پیغام آیا ہے۔ تمہارے متعلق میرے دل میں ایک خواہش تھی، لیکن کاش میں یہاں آنے سے پہلے ابا جان کو کچھ بتا سکتا۔ معظم علی تمہیں ایک بھائی کے منہ سے ایسی باتیں عجیب معلوم ہوں گی۔ لیکن اب تمہیں شاید یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہ ہو۔ کو میں اپنے دل میں فرحت کا مستقبل تمہارے ساتھ وابستہ کر چکا تھا۔ معظم! وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اتنی جان کسی اور جگہ اس کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن مجھے اس کے دل کا حال معلوم تھا اور میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ ابا جان کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس کے مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کریں گے۔ لیکن اگر ان کا ارادہ کچھ اور ہو تو انہیں اتنا حذر دے دینا کہ فرحت کے متعلق میری خواہش یہ تھی۔ یہ باتیں میں نے اس لیے کہی ہیں کہ فرحت کے دل کا حال مجھے معلوم ہے۔ تمہیں چاہتی ہے جب تم اڑلیہ کے محاذ پر جا رہے تھے اس کے آنسو مجھے بھانسنے کے لیے کافی تھے۔ اس سے پہلے میں نے اپنی تخیل بہن کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ آصف نے یہاں تک کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

معظم علی نے ایک سپاہی کو پانی لانے کے لیے کہا اور اس نے اپنی چھال کھول کر آگے

تھیں مبارک باد کا متحق سمجھتا ہوں۔

معظم علی نے جواب دیا: "مرہٹوں کو آپ کے تعاقب کے لیے کھلے میدان میں آنے کی ضرورت نہ تھی۔ بالخصوص اس حالت میں جب کہ وہ آصف بیگ کے ایک ہزار سپاہیوں پر اپنی تلواروں کی تیزی آزماسکتے تھے۔"

میر جعفر نے کہا: "مجھے آصف بیگ کی موت کا افسوس ہے۔ لیکن اگر وہ میری حکم مدولی ذکر آ تو یہ صورت حالات پیدا نہ ہوتی۔"

لیکن اگر آپ بھی اس کی طرح جان دینا پسند کرتے تو یہ صدمت حالات پیدا نہ ہوتی۔ میر جعفر کا چہرہ خستہ سے متا تھا۔ لیکن اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کی۔

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا: "میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے چنوکس دور ایک قلعے پر چلنے کی اجازت دی جائے۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم پہلے ٹھانڈ میں جا کر اس مہم کے لیے عطار اللہ کی اجازت حاصل کرو؟"

"میں عطار اللہ خاں سے اجازت لے چکا ہوں۔ مجھے صرف آپ کے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس جنگل سے شکست کھا کر بھاگنے کے بعد مرنے اس قلعے کا رخ کریں گے۔ اس لیے میں کسی تاخیر کے بغیر مشق قری کرنا چاہتا ہوں۔"

میر جعفر نے کہا: "میں اس مہم میں تمھارا ساتھ دوں گا۔"

"لیکن اس چھوٹی سی مہم کے لیے آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں

کہ آپ مجھے اپنی فوج کے ڈیڑھ ہزار سپاہی ساتھ لے جانے کی اجازت دیں۔"

"نہیں، میں خود بھی چلوں گا۔"

"بہت اچھا! لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مرزا حسین بیگ کو آصف کی موت کی اطلاع

کردی۔ معظم علی نے آصف کی گردن کو سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کے چند گھونٹ پلانے کے بعد اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

آصف بیگ نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور نجیت آواز میں کہا: "میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کا آخری فرض پورا کر چکا ہوں۔"

کوئی ایک گھنٹہ تک آصف کی یہ حالت رہی کہ وہ تنہا دیر کے لیے ہوش میں آتا اور معظم علی سے چند باتیں کرنے کے بعد پھر اس کی بید کر لیتا۔

معظم علی باتیں کرنے یا بٹنے کی طاقت نہ تھی وہ چھڑائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوج کے سپاہی ان کے گرد سر ہٹکائے کھڑے تھے۔ آصف بیگ نے آخری بار آنکھیں کھولیں اور آسمان کی نیلیوں فضاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈوبتی آواز میں "ابا جان" "امی جان" "افضل" اور فرحت کے الفاظ چند بار دہرائے اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

معظم علی نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر کچھ دیر اس کے سینے کے ساتھ کان لگانے کے بعد "ان اللہ وانا الیہ راجعون" کہہ کر اس کا سر زمین پر رکھ دیا۔ اپنی آنکھوں سے ابلتے ہوئے آنسو پونچھنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسو جھپک رہے تھے۔ اور جنگل کی خاموش فضا میں ہلکی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

معظم نے شہیدوں کو دفن کرنے کا حکم دیا اور میر جعفر کو لڑائی کے واقعات کی اطلاع دینے کے لیے ایک افسر اور چند سپاہی روانہ کر دیئے۔



نہی کے کنارے میر جعفر بڑی بے چینی کے ساتھ فوج کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ معظم علی کو دیکھتے ہی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا: "نہ جان تمھارا یہ اقدام میری خواہش کے مطابق نہ تھا۔ میری خواہش یہ تھی کہ مرہٹوں کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ کی جائے۔ لیکن میں

تین ماہ کے بعد معظم علی نے دو مہینے کی چھٹی لی اور مرشد آباد روانہ ہوا :



ایک روز دوپہر کے وقت مرزا حسین بیگ بخار کی حالت میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اس کی بیوی، افضل اور فرحت اس کے بستر کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے معظم علی کی آمد کی اطلاع دی۔ افضل جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ حرجت برابر کے کمرے میں چلی گئی اور نیم دا دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، افضل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ حسین بیگ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ افضل کی والدہ بڑی شکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

معظم علی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔ اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا: چا جان! چچی جان! مجھے انہوں سے کہیں آخری منزل تک آصف کا ساتھ نہ دے سکا۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا! حسین بیگ نے اس کی طرف پدرلہ شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ بالاخر حسین بیگ نے مہر سکوت توڑی۔ ”معظم! میں اس کی قبر دیکھنے کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا، لیکن بیماری کے باعث سفر کرنے کے قابل نہ رہا۔ مجھے تمہارا خط ملا تھا۔ لیکن میری یہ خواہش تھی کہ اس کی شہادت کے تمام واقعات تمہاری زبانی سنوں۔“

معظم علی نے شروع سے لے کر آخر تک تمام واقعات بیان کر دیئے جب وہ آصف کی موت کی تفصیلات سن رہا تھا تو اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ فرحت سے معلق رہا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ آخری لمحات میں آصف بار بار اپنی بہن کو یاد کرتا تھا۔

اس کے بعد معظم علی صبح شام حسین بیگ کی تیار داری کے لیے جانا اور کئی گھنٹے

دینے کے لیے کوئی ایچی رواز کر دیں :

”اس کا انتظام ہو جائے گا۔ اب بتاؤ ہمیں کب یہاں سے روانہ ہونا چاہیے؟“ ابھی اسی وقت! معظم علی نے جواب دیا :



اگلے دن صوبہ آفتاب سے قبل بنگال کی فوج کسی شدید مزاحمت کا سامنا کیے بغیر سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکی تھی۔ میر جعفر کی حیثیت اس ہم میں ایک خاموش تماشا سے زیادہ نہ تھی۔ اور فوج کی کمان عملاً معظم علی کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن فتح کے بعد وہ عطا اللہ خاں اڈیسہ کے صوبیدار، میرمدن اور علی وردی خاں کے نام اس قسم کے خطوط لکھ رہا تھا۔

”خدا نے ہمیں بہت بڑی فتح دی ہے۔ ہم نے اڈیسہ کی سرحد پر مہیوں کا سب سے بڑا مستقر چھین لیا ہے۔ اب مجھے امید ہے کہ دشمن ایک مدت تک اپنے زخمیں چاٹتا رہے گا۔“

علی وردی خاں کے نام اس کے خط کے آخری فقرے یہ تھے : ”اس حقیر غلام نے اپنی بساط کے مطابق حضور پرورد کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مرشد آباد پہنچ کر حضور کی قدم پوی کا شرف حاصل کروں اور حضور کو یہ خوشخبری سناؤں کہ اڈیسہ کی سرزمین دشمن کے دہراک ہو چکی ہے۔“

تیسرے دن عطا اللہ خاں باقی فوج کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اس نے کون درہ بھتے قلعے میں قیام کیا۔ اس عرصے میں اسے شمال مغرب کے سرحدی علاقوں پر مہیوں کے آڑے محسوس کی خبر ملی اور اس نے معظم علی کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ کوچ کا حکم دیا۔

دس دن بعد معظم علی واپس آیا اور اس نے اطلاع دی کہ شمال مغرب کے سرحدی علاقے مہیوں کے دھڑے پاک ہو چکے ہیں۔ عطا اللہ خاں نے معظم علی کو قلعے کی حفاظت پر تین کر کے کلک کی طرف کوچ کیا۔

اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ مرثا بادی اس نے ابھی کوئی بیس دن گزرا ہے تھے کہ سے میردن نے اپنے پاس بلایا اور کہا: "معظم علی! سرحد کے حالات ٹھیک نہیں۔ سرٹوں نے پھر سراٹھایا ہے اور جاسوسوں نے ملی وردی خاں کو اطلاع دئی ہے کہ عطار اللہ خاں اور میرجعفر کلک میں بیچ کر حکومت کے خلاف کوئی خطرناک سازش کر رہے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فوراً میری قلعے میں پہنچ جاؤ۔ اور اس بات کا خیال رکھو کہ یہ لوگ مرہٹوں کے ساتھ کوئی ساز باز نہ کر سکیں۔"

اگر حالات ایسے ہی تو ہیں آج ہی دواڑ بھجادی گا۔

میرمدن نے میز سے ایک کاغذ اٹھایا اور معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ تمہارے نئے عہدہ کے متعلق ملی وردی خاں کا حکم نامہ ہے۔ تمہیں اڑیسہ کے نائب فوجدار کی حیثیت میں سرحدی اضلاع کا محافظ مقرر کیا گیا ہے۔ تمہاری کمان میں مستقل طور پر دو ہزار سپاہی دیئے گئے ہیں اور کلک کے صوبیدار کو یہ ہدایت کردی گئی ہے کہ سرحد پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے کے لیے سرکاری خزانے سے مطلوب رقم ادا کردی جائے۔ آج تمہارے لیے کوچ کی تیاری کرنا مشکل ہوگا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کل صبح تڑکے روڑاں بوجاؤ۔ عطار اللہ خاں کو یہ حکم بھیج دیا جائے گا، کہ وہ مزید ایک ہزار سپاہی تمہاری کمان میں دے دے۔"

میرمدن سے ملاقات کے بعد معظم علی اپنے گھر پہنچا تو اس کی والدہ بالا خانے کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

معظم علی نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا: "امی جان! میری چھٹی منسوخت کردی گئی ہے اور میں کل صبح یہاں سے جا رہا ہوں۔"

ماں نے پریشان ہو کر کہا: "بیٹا تمہیں کسی خطرناک مہم پر تو نہیں بھیجا جا رہا ہے؟"

"نہیں امی جان! مجھے اڑیسہ کے سرحدی اضلاع کا نائب فوجدار مقرر کیا گیا ہے۔"

"نائب فوجدار؟" ماں نے چونک کر سوال کیا۔

ماں امی جان! کیا آپ کے خیال میں نائب فوجدار بہت بڑا ہوتا ہے؟

نہیں بیٹا! میں تو دعا کیا کرتی ہوں کہ تم کسی دن بنگال کی فوج کے سپہ سالار بنو۔

تمہارے آبا جانا یہ خبر سن کر بہت خوش ہوں گے۔ ماں میں تمہیں ایک بات بتانا بھول گئی تھی۔ آصف کی موت کی خبر آنے سے چند دن پہلے ڈھاکہ کا کوئی بہت بڑا رئیس، جو مرزا حسین بیگ کا رشتہ دار ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ ان کے یہاں آیا تھا۔ وہ اپنے لڑکے کے لیے فرحت کا رشتہ مانگتے تھے۔ حسین بیگ کی بیوی کی یہی خواہش تھی کہ فرحت کی لنگی ماں کردی جائے لیکن مرزا صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب آصف واپس آئے گا تو میں اس کے ساتھ ڈھاکہ جاؤں گا، اور لڑکے کو دیکھ کر فیصلہ کر دوں گا۔ بیٹا! میں کبھی یہ سوچا کرتی تھی کہ فرحت میری بہو بنے گی لیکن ایک دن میں نے تمہارے ابا سے ذکر کیا تو وہ مجھ پر برس پڑے کہنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں سے نکلنا چاہتی ہو۔ مرزا صاحب کا یہ احسان قبول ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اس قدر مہربانی سے پیش آتے ہیں تمہیں معلوم نہیں کہ وہ خاندان جس نے فرحت کا رشتہ مانگا ہے، کوئی ڈیڑھ دو سو گاؤں کا مالک ہے، پھر ہمدی اگر لنگی حیثیت ہوتی ہی تو مرزا حسین بیگ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی بلادی سے باہر لڑکی کا رشتہ کریں گے۔ اگر تمہارے آبا جانا منع نہ کرتے تو میں شاید فرحت کی ماں سے اس کے متعلق پوچھ بیٹھتی۔ فرحت بہت اچھی لڑکی ہے، اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ میری بہو بنے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں تمہاری ترقی کے لیے بہت دعا کیا کرتی ہوں کبھی میں یہ سوچتی ہوں کہ مرزا صاحب تم سے بلا دو اس قدر محبت نہیں کرتے۔ جو سکتا ہے کہ انھوں نے فرحت کے متعلق اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر رکھا ہو اور وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہوں، جب تم اپنی ذاتی قابلیت کے بل بوتے پر اپنے خاندان کے لوگوں کی مہم کی کا دعویٰ کر سکو۔ ورنہ فرحت کے لیے کھنڈ کے ایک بہت بڑے گھر لے کر آئے گا اور مرزا صاحب نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔"

چٹا باب

عطار اللہ خاں کنگ کے قلعے کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ معظم علی کمرے میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ عطار اللہ خاں نے کہا: مجھے کل ہی تمہارے متعلق حکم ملا تھا۔ میں تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا نیا عہدہ اڑیسہ کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟

”اگر فوج تیار ہے تو میں کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔“
”فوج کے لیے چند دن تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ میں جو دستے تمہاری کمان میں دینا چاہتا ہوں۔ وہ بردوان اور میدنا پور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ میں آج ہی انہیں حکم بھیجتا ہوں۔“

معظم علی نے کہا: ”سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کی تازہ سرگرمیوں کے پیش نظر میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ سپاہیوں کو وہاں سے سیدھا سرحدی قلعے میں پہنچنے کا حکم بھیج دیں۔ میں کل علی الصبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔“
”بہت اچھا۔ میں ابھی انہیں حکم بھیج دیتا ہوں۔ آج آپ میرے مہمان ہیں میں نے میرے صبر سے آپ کی ترقی کا ذکر کیا تھا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔“
”میرے صبر یہاں ہیں؟“ میرا تو خیال تھا کہ وہ بردوان میں ہوں گے۔“

”امی جان!“

”کیا ہے بیٹا؟“

”مجھے نہیں امی جان۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھ سے پہلے آپ کو بھائی یوسف کے متعلق سوچنا چاہیے تھا۔“

ماں نے جواب دیا: ”یوسف کے لیے تین رشتہ آئے ہیں۔ لیکن وہ تینوں لوگیاں مجھے پسند نہیں۔ عبداللہ خاں کی لڑکی مجھے پسند تھی۔ لیکن وہ یہیں۔ ۷ کلکتہ جا چکے ہیں۔ تمہارے آبا جان نے کئی بار وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر انہیں فرصت نہیں ملی۔ پچھلے مہینے ان کا خط آیا تھا کہ وہ اس سال حج کے لیے جارہے ہیں۔ جب وہ حج سے واپس آئیں گے تو میں تمہارے آبا جان کو ضرور بھیجوں گی۔“

معظم علی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ ماں نے پوچھا۔

”مرزا صاحب کے پاس۔“

دروازے کے قریب پہنچ کر معظم علی نے مرگماں کی طرف دیکھا اور کہا:

”امی جان! پرچ بتائیے آپ کو فرصت بہت پسند ہے؟“

”ہاں بیٹا!“

”لیکن امی جان میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔“

”جھوٹا کہیں کا۔“ ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور معظم علی ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

عطار اللہ خاں نے جواب دیا: "وہ ایک ضروری مشورے کے لیے یہاں آئے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ان سے خوش نہیں۔ کیونکہ آپ مرشد آباد میں حضور نواب صاحب سے ملے تھے؟"

میں نے: "معلم علی نے جواب دیا: میں دہلی صرف میرمدن سے ملا تھا۔ اچھا یہ بتائیے آپ نے میرمدن سے میرجفر کے متعلق کوئی بات کی تھی؟"

"نہیں ان کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔"

عطار اللہ خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا: "میرجفر کا خیال ہے کہ دہلی میں کہیں امراء ان کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں، اور کئی مرتبہ انھوں نے مجھے بھی خبردار کیا ہے کہ مرشد آباد میں تمہارے خلاف بھی طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی ہیں۔"

"میرا تو یہ خیال ہے کہ حکومت مرہٹوں کے خلاف آپ کی کارگزاری پر بہت خوش ہے تاہم اگر آپ بڑا دماغ تو ہیں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

"مجھے آپ جیسے غصے دو ستوں کے نیک مشوروں کی ضرورت ہے کیونکہ؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرجفر کے متعلق محتاط رہیں۔ میرجفر اگر کوئی غلطی کریں تو ان کا سب سے بڑا ستھاپ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بنگال کے حکمران کے رشتہ دار ہیں۔"

عطار اللہ خاں نے کہا: "آپ کو معلوم ہے کہ میں ذاتی طور پر میرجفر کو پسند نہیں کرتا۔"

"یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

"میں آپ کا شکریہ گزار ہوں۔ لیکن آپ کے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا کہ میرجفر مجھے ہکا سکتا ہے؟"

معلم علی نے پریشان ہو کر جواب دیا: "میں نے یہ نہیں کہا کہ میرجفر آپ کو ہکا سکتا ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ آپ محتاط رہیں۔"

عطار اللہ چند تائیں غور سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولا: "معلم علی! میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔ اگر مرشد آباد میں میرے دشمن میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں تو مجھے آگاہ کرنا تمہارا فرض ہے۔"

مجھے آپ کے خلاف کسی سازش کا علم نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس قدر پریشان ہوں گے تو میں آپ سے ایسی باتیں نہ کرتا۔ میرجفر کے متعلق یہ بات عام ہو چکی ہے کہ بنگال میں ہر سازش سب سے پہلے ان کے دماغ میں جنم لیتی ہے۔ وہ چند جاہ پسندوں کو پہلے حکومت کے خلاف بغاوت پر اکساتے ہیں اور پھر اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے علی وردی خاں کو باخبر کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغاوت کچل دی جاتی ہے۔ چنانچہ ہم اور ان کے ساتھ چند بے گناہ مارے جاتے ہیں اور میرجفر کو یہ ثابت کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اپنی انتہائی نااہلی کے باوجود وہ حکومت کے لیے ایک کارآمد آدمی ہیں۔ میں تو یہاں تک محسوس کرتا ہوں کہ ایک دن ایسا آئے گا جب علی وردی خاں کو امراء کی آئے دن کی بغاوتیں اسی قدر بدل کر دیں گی کہ انھیں میرجفر کے سوا اپنا کوئی خیر خواہ نظر نہ آئے گا اور یہ دن بنگال کی تاریخ کا بدترین دن ہوگا۔"

عطار اللہ خاں نے کہا: "میں ایک سپاہی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ میرجفر کیا کرنا چاہتا ہے اور علی وردی خاں اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔"

"ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور اس نے عطار اللہ خاں سے کہا: میرجفر تشریف لائے ہیں۔"

معلم علی نے اٹھ کر کہا: "اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"بہت اچھا۔ عطار اللہ خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا: آپ میرے مکان پر جا کر آرام کریں۔"

میرجفر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے عطار اللہ خاں کے ساتھ مصافحہ کرنے کے

بعد معظم علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ کب آئے؟"

میں ابھی یہاں پہنچا ہوں۔

"تشریف رکھیے!" میرے جھرنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"نہیں، مجھے اب اجازت دیجیئے!"

عطار اللہ خاں نے کہا: "میر صاحب! یہ بہت تکے ہوئے ہیں۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ ہم شام کے وقت باتیں کریں گے۔"

پھر وہ سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "تم انھیں میرے مکان پر چھوڑ آؤ۔"

معظم علی سپاہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میر جعفر اور عطار اللہ خاں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر میر جعفر نے کہا: "اس نوجوان کے متعلق آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ یہ میر مدن کا خاص آدمی ہے۔"

عطار اللہ خاں نے کہا: "میں اسے جانتا ہوں اور آپ نے کل جن خدشات کا اظہار کیا تھا۔ وہ کسی حد تک درست ثابت ہو رہے ہیں۔ معظم علی کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ حکومت کے حاسوس ہمارے متعلق کافی چوکس ہیں۔ معظم علی آپ کو میرا دشمن سمجھتا ہے اور اس نے مجھے آپ کے متعلق خبردار رہنے کا مشورہ دیا ہے۔"

میر جعفر کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا۔ "آپ نے کہیں اسے اعتماد میں لینے کی کوشش تو نہیں کی؟"

نہیں میر صاحب! میں اتنا بیوقوف تو نہیں ہوں۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ حکومت ہمارے عزائم کے متعلق کس حد تک باخبر ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مرشد آباد میں میرے متعلق کوئی خطرناک اطلاع نہیں پہنچی۔ تاہم یہ آپ کی جوتی ہے کہ آپ کو ہر جگہ شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہمیں اب آخر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ فوج کے افسر میرے ساتھ ہیں۔ صوبیدار نے اگر ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا۔ تو وقت آنے پر اس کے گھر

کا ہمارو کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس نوجوان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر اسے بروقت ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا تو ہمارے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ میرے نزدیک ہر آدمی کے ضمیر کی ایک قیمت ہے۔ لیکن معظم علی اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ پوری قوت کے ساتھ ہماری مخالفت کرے گا اور سرحدی اضلاع کی چوکیوں کے کمانڈر کی حیثیت سے اس کی مخالفت ہمارے لیے کافی مشکلات پیدا کر دے گی۔"

میر جعفر نے کہا: "لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اسے سرحد تک پہنچنے کا موقع دیا جائے؟"

"نہیں، یہ ضروری نہیں۔"

میر جعفر نے کہا: "لیکن موجودہ حالات میں اس پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔"

"ہم اس پر ہاتھ ڈالے بغیر اسے سرحد تک پہنچنے سے روک سکتے ہیں۔ میر حبیب کا بیٹا اگر وہاں نہیں چلا گیا تو اسے یہ پیغام دے کر روانہ کر دیجیے کہ معظم علی کل صبح یہاں سے روانہ ہوگا اور یہ وہی نوجوان ہے جس نے مرزا حسین بیگ کی حویلی کی حفاظت کی تھی۔ آپ اسے یہ بھی بتادیں کہ وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہوگا۔ مرشد آباد سے صرف آٹھ سپاہی اس کے ہمراہ آئے ہیں اور یہی اس کے ساتھ یہاں سے جائیں گے۔ سکک اور سرحدی علاقے کے درمیان کئی مقامات ایسے ہیں۔ جہاں میر حبیب کے آدمی اس کو آسانی کے ساتھ گرفتار کر سکتے ہیں۔ اگر یہ تجویز کامیاب ہوگی تو ہمارے راستے سے ایک پتھر ہٹ جائے گا اور ہم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔"

میر جعفر نے کہا: "لیکن وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگا؟"

عطار اللہ خاں نے جواب دیا: "میں اسے بتا چکا ہوں کہ اس کے جھٹے کی فوج بردوان اور مینا پور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔"

میر جعفر نے کہا: "آپ میری توقع سے زیادہ دوراندیش ہیں۔"

عطار اللہ خاں نے مسکرا کر کہا: "میر صاحب! یہ سب آپ کی صحبت کا اثر ہے۔"

اگلے روز صبح کی نماز کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے سے باہر

ہے کہ تم بھیجا رہیں گے دو!"

معظم علی چند لمبے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے اپنی ہنڈی اور توار پھینک دی اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔

ایک اویسٹر عرکا آدمی جواب دہی سے اس جیسے کا سردار معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور اس نے معظم علی سے غائب ہو کر سوال کیا: "تم کہاں سے آئے ہو؟"

معظم علی نے جواب میں کہا: "میں ہم سے سوالات پوچھنے کی ضرورت نہیں، یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

مرہٹہ سردار بولا: "ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

مرہٹہ سردار نے جواب دیا: "قیدیوں کو ایسے سوالات کرنے کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ میں تمہاری جان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر کسی نے راستے میں جھگڑنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔"

مرہٹہ سردار کے اشارے سے چند آدمیوں نے آگے بڑھ کر ان کے گھوڑوں اور اسلحہ پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کے ہاتھ دھوئے۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی اور اس کے ساتھی قیدیوں کی حیثیت میں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ایک ہفتہ جنگوں اور پہاڑوں میں سفر کرنے کے بعد انہیں سرحد کے پار ایک گاؤں کے قریب مرہٹہ فوج کا پڑاؤ دکھائی دیا۔ معظم علی اور اس کے ساتھی مرہٹہ سپاہیوں کی ہنڈیوں کے پہرے میں پڑاؤ عبور کرنے کے بعد گاؤں میں پہنچے اور پھر ایک تنگ گلی سے گزر کر ایک قلعہ محرابی کے اندر داخل ہوئے۔ مرہٹہ فوج کے چند سپاہی انہیں دیکھتے ہی جمع ہو گئے۔

معظم علی کو گرفتار کرنے والے دستے کے سردار نے ان کے اسٹرکٹ فوٹب کتے ہوئے کہا:

"سیر سالار کا حکم ہے کہ ان قیدیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے۔ انہیں کوئی تکلیف

نکل ہے تھے کہ میر جعفر دروازے کے قریب ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

"معظم علی ٹھہرو!" اس نے اپنا ہاتھ بند کرتے ہوئے کہا۔

معظم علی نے گھوڑا روکا۔ میر جعفر نے کہا: "مجھے تمہاری فرض شناسی کا اعتراف ہے لیکن میرے خیال میں یہ بہتر ہوتا کہ تم فوج کو ساتھ لے کر جاتے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر راستے میں تمہیں کوئی خطرہ پیش آیا تو یہ اٹھ آدمی تمہاری حفاظت کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "میری حفاظت کا مسرہ اس قدر اہم نہیں اور میں فوج کے انتظار میں بیان ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

"بہر حال تمہیں راستے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ گذشتہ چند دنوں میں مرہٹے یہاں سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر کئی بستیاں لوٹ چکے ہیں۔ یہ کہہ کر میر جعفر، معظم علی کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔"

معظم علی بنگال کی فوج کا بہترین سپاہی ہے اور اس کی جان بہت قیمتی ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی حفاظت کا خیال رکھو!"

معظم علی نے کہا: "آپ میری خوراک کریں۔"



دن بھر سفر کرنے کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھیوں نے رات کے وقت ایک گاؤں کے زمیندار کے ہاں قیام کیا۔ آگے دن دوپہر کے وقت وہ ایک ندی کے قریب تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے رُکے۔ ندی کے دونوں کناروں پر گھنے درخت تھے۔ کچھ دیہستان کے

بعد وہ ظہر کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ درختوں کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کھول رہے تھے کہ اچانک چاروں طرف درختوں کی آڑ سے قریباً پچاس مسلح مرہٹے

نودار ہوئے۔ معظم علی کے ساتھیوں کے لیے گھوڑوں پر سوار ہوئے یا بندوقیں منبھالنے کا موقع نہ تھا۔ پچاس آدمی بندوقیں سیٹھی کیے ان کے گرد گھیر اڑھل رہے تھے۔

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا: "اب معاملے سے کوئی فائدہ نہیں تمہارے لیے یہی بہتر

اس حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی، لیکن کوئی بیس دن ہوئے میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، جب سے مجھے یہاں بند کر دیا گیا ہے۔

معظم علی حیرانی کے عالم میں قیدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی بارہ چودہ سال کا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں اور سرخ دھندلے چہرے کے تھکے نقوش میں غایت درجہ کی جاؤہیت تھی۔

”تمیں کس جرم میں قید کیا گیا ہے؟“ معظم علی نے سوال کیا۔

”میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ لیکن لڑکے نے قدر سے برم ہو کر جواب دیا۔

معظم علی نے کہا: ”تھاری صورت بتا رہی ہے کہ تم کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو اور یہاں کیسے پہنچے ہو؟“

لڑکے نے کچھ سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگزشت شروع کر دی:

”میرا گاؤں مدھیہ کھنڈ میں ہے، عظیم خاں میرے ابا جان تھے اور وہ اپنے علاقے کے سردار تھے۔ انھیں گھوڑوں کی تجارت کا شوق تھا۔ وہ راجپوتانہ سے گھوڑے خرید کر کبھی کبھار کبھی حیدرآباد میں فروخت کیا کرتے تھے۔ میرا بڑا بھائی عام طور پر ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اس سال

میں نے قتل کی اور وہ اس کی بجائے مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے ساتھ چالیس مسلح فوجی تھے اور ہم راجپوتانہ سے ڈیڑھ سو گھوڑے خرید کر کھنڈ کی طرف آرہے تھے۔ راستے میں اودھ کی سرحد سے تھوڑی دور مرہٹوں نے ہم پر حملہ کر دیا، لیجان لالہ کے ساتھ چندہ اور آوی ملڑانی میں شہید ہو گئے۔ سات آدمی مرہٹوں نے گرفتار کر لیے اور باقی بھاگ گئے۔ مرہٹوں کے سردار نے باقی

آدمیوں کو قتل کر دیا، لیکن مجھے اپنے پاس رکھا اور چند دن بعد میری میسر کے پاس بھیج دیا۔ میری میسر نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ وہ کبھی کبھی چند دن کے لیے یہاں آتا ہے اور ہمیشہ مجھ سے یہ پوچھتا ہے: تمیں میرے سپاہیوں نے کوئی تکلیف تو نہیں دی؟ اگر میں کسی کی شکایت کرتا ہوں تو

اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے لیکن جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے میرے گھر بھیجا

نہ دی جائے۔ لیکن اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے کسی وقت کے بغیر چھاپسی پر لٹکا دیا جائے۔ سپہ سالار کچھ عرصہ یہاں نہیں آسکیں گے۔ پھر اس نے معظم علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”یہ بنگال کی فوج کے ایک بڑے افسر ہیں اور سپہ سالار کی ہدایت ہے کہ ان کا خاص خیال رکھا جائے۔“

افسر نے اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”انھیں لے جاؤ اور کوٹھڑیوں کے اندر بند کر دو۔“ لیکن ایک کوٹھڑی میں دو قیدی بند کیے جائیں۔

معظم علی نے آگے بڑھ کر افسر سے سوال کیا: ”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ ہم کس کی قید میں ہیں؟“

اس نے بے رخی سے جواب دیا: ”ایک قیدی کو ایسے سوالات پوچھنے کا حق نہیں ہے۔“ پھر وہ سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا: ”انھیں اکبر خاں کے ساتھ بڑی کوٹھڑی میں رکھو۔“

پھر ملید، قیدیوں کو حویلی کے ایک طرف لے گئے۔ معظم علی کے آٹھ ساتھیوں کو چار کوٹھڑیوں میں بند کر دیا اور اس کے بعد انھوں نے ایک کشتہ کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور معظم علی کو اندر داخل ہونے کے لیے کہا۔

معظم علی کوٹھڑی کے اندر داخل ہوا اور پھر ملیدوں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر کوٹھڑی کے درمیان بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ کوڑا کے ڈراؤ سے سپہ سالار کے سورج کی کرنیں اندر آرہی تھیں۔ فرش پر کھجور کی چٹائیاں بھی ہوتی تھیں۔ معظم علی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ معاسے کوٹھڑی کے ایک تارک کوٹھڑی میں ایک اور قیدی دکھائی دیا جو بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا: ”بھائی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے کچھ عرصہ کے لیے ہمیں ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں!“

قیدی جلدی سے اڑکھڑکے بڑھا اور معظم علی کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا:

”میرا نام اکبر خاں ہے۔ مجھے مرہٹوں کی قید میں تو بیاتین میں نے گزر چکی ہیں۔ پہلے مجھے

شہر خ کیل رہے تھے۔ یہ دونوں اپنے لباس سے مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ ایک نے بلا پتلا
نہ جان تھا اور دوسرا جس کی عمر چالیس سال سے اوپر معلوم ہوتی تھی وہ ہرے جسم کا ایک
بار عیب آدمی تھا۔

• تعالٰی نام معظم علی ہے؟ قوی بیکل آدمی نے سوال کیا۔

• ہاں! معظم علی نے جواب دیا۔

• میں نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کسی قیدی کو بلاوجہ تکلیف نہ دی جائے
تھیں میرے آدمیوں سے کوئی شکایت تو نہیں؟

معظم علی نے جواب دیا: ایک قیدی کو کیا شکایت ہو سکتی ہے؟

• ہم کوشش کریں گے کہ تم اپنی قید کو بہت زیادہ محسوس نہ کرو۔ میں ہمارے ہی عورت
کرتا ہوں اور تم مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت میں اپنی جرات و ہمت کا ثبوت
دے چکے ہو۔

معظم علی نے کہا: آپ کی معلومات قابلِ داد ہیں۔

• تمہارے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہ
تھی۔ اب یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ مرشد کا نائب فوجی اور اس کے آٹھ ساتھی کہیں دوپوش
ہو گئے ہیں اور میرے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہ تھا، مگر یہ نائب فوجی اور کون ہے؟

میں اپنی ذات کے لیے آپ سے کسی نیکی کی توقع نہیں رکھتا۔ لیکن اگر آپ میرے حبیب
ہیں تو میں جنگل سے آپ کی دشمنی کی وجوہات پوچھنا چاہتا ہوں۔

میرے حبیب نے جواب دیا: میں کسی کا دوست ہوں نہ دشمن۔ میری دلچسپی صرف جنگل
کے حکمران اور امراء کی دولت سے ہے۔

• لیکن آپ مرہٹوں کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں؟

• مرہٹے مجھے دولت حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مجھے انہوں سے کہ تم کسی دولت مند

دیا جائے تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ جب میں روہیلکھنڈ پر حملہ کروں گا۔ تو تمہیں ساتھ لے جاؤں
گا۔ تمہارے باپ نے اپنے گھر میں بیٹھا ردولت جمع کر رکھی ہے اور جب تم مجھے اپنے گھر
کا خزانہ تلاش کرنے میں مدد دو گے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ جب میں اس سے یہ کہتا ہوں
کہ ہمارے گھر میں کوئی خزانہ نہیں تو وہ کہتا ہے کہ اگر تمہیں خزانے کا علم نہیں تو ہم تمہارے
بھائی سے پوچھ لیں گے۔ میرے حبیب کو یہ یقین تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔
اس لیے مجھے اس حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ ایک شام میں یہاں سے
بھاگ گیا اور ساری رات جھپٹوں اور پہاڑیوں میں گھومتا رہا۔ لیکن صبح کے وقت چند سوار
مجھے دوبارہ گرفتار کر کے یہاں لے آئے خوش قسمتی سے میرے حبیب یہاں نہیں تھا اور
اس کے سپاہیوں نے مجھے اس کو ٹھہری میں بند کرنے کے علاوہ کوئی اور سزا نہ دی۔ جب
میرے حبیب آیا تو اس نے مجھے دو دن بھوکا رکھنے کی سزا دی۔ اب پھر میرے مجھے صبح شام
تھوڑی دیر کے لیے اس کو ٹھہری سے باہر نکالتے ہیں۔ لیکن ان کا پہرہ اس قدر سخت ہوتا ہے
کہ اب میرے لیے دوبارہ بھاگ نکلنا ممکن نہیں۔ مجھے انہوں سے کہ آپ بھی ان کی قید
میں ہیں۔ بتائیے آپ یہاں کیسے پہنچے؟

معظم علی نے جواب دیا: میں کلک سے اڑلیہ کے ایک سرحدی قلعے کی طرف آ رہا
تھا۔ راستے میں مرہٹوں نے اچانک حملہ کیا اور مجھے گرفتار کر لیا۔ تم سے بات کرنے سے پہلے
مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں میرے حبیب کی قید میں ہوں۔



چھ ماہ بعد ایک صبح چار مسلح سپاہیوں نے معظم علی کو ٹھہری سے نکالا اور اپنے ساتھ
چلنے کو کہا۔ معظم علی کوئی سوال کیے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔ سپاہی ایک کمرے کے دروازے
پر رُکے اور معظم علی ان کے اشارے پر کمرے کے اندر داخل ہوا۔

یہ کسٹا وہ بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ اور دو آدمی قالین پر بیٹھے

آدی کے بیٹے نہیں ہو۔ لیکن اگر تم مجھے کسی دولت مند آدمی کے گھر کا پتہ بتاؤ تو مجھے تمہارا تعاون حاصل کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

معظم علی نے سخت سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا: "میں تمہیں ایک ہی گھر کا راستہ بتا سکتا ہوں اور وہ مرشد آباد کا قید خانہ ہے۔"

میر حبیب نے بے پردگی سے جواب دیا: "قید خانے میں وہ جلتے ہیں جن کی کسی کو بھی ضرورت نہ ہو اور میں بدترین حالات میں بھی بنگال کے حکمران کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اسے میری ضرورت ہے۔ تم ایک ذہین آدمی ہو لیکن میں حیران ہوں کہ تم نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ تم بڑے بڑے امراء کی تجویزوں پر پروہ دے کر بنگال کی کوئی خدمت کر رہے ہو؟"

مگر تمہیں اس بات کا اندسہ ہے کہ تمہارے سپاہی حسین بیگ کے گھر سے نامراد واپس آئے تھے تو میں تمہاری غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں۔ مرزا حسین بیگ کے گھر میں روپیہ نہیں بلکہ عزت تھی جس کی حفاظت ہر شریف آدمی کا فرض تھا۔

میر حبیب نے جواب دیا: "میں نے اپنے جیسے جیسے میں کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو موت کے سنی سمجھتا ہو۔ وہ صرف دولت اور حکومت کے سنی سمجھتے ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "میں جہ بنگال کی عزت اور آزادی کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں وہ صرف امیروں اور حکمرانوں کا بنگال نہیں ہے میرا وہ بنگال ہے جسے لاکھوں مسلمان اپنا او اپنی آنے والی نسلیں کا وطن سمجھتے ہیں۔ یہ میرا گھر ہے اور یہ اسے چوروں، راہزنوں اور انسانیت کے دشمنوں سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔"

• (وجہ!) میں تمہارے خیالات کی داد دیتا ہوں۔ لیکن جس بنگال کو میں جانتا ہوں، اس کے محافظ میرے نزدیک باہر کے راہزنوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ دن بہت جلد آ رہا ہے جب تم بنگال کے متعلق سوچنے کی بجائے اپنے متعلق سوچنا زیادہ بہتر سمجھو گے صرف

علی مدنی خاں کے آنکھیں بند کرنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد تم بنگال کے متعلق سوچنا ہی تمہاری بہتر سمجھو گے۔ اتنی دیر شاید تم میری قید میں رہو۔ لیکن اگر اس سے پہلے ہی تمہارے خیالات میں کوئی تبدیلی آجائے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ تمہارا تعاون قبول کر دوں گا۔ پھر تم بنگال کے متعلق نہیں بلکہ اپنے متعلق سوچیں گے۔ بالکل مرشد آباد کے امراء کی طرح، جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو ملی وردی خاں کا واحد جانشین سمجھتا ہے۔ ان لوگوں کے نفوس کے جواب میں میں بھی یہ نعرہ لگانے کا حق ہے کہ بنگال ہمارا ہے۔

معظم علی نے کہا: "اگر آپ کی رفعت سے مجھے دلی کائنات ملنے کی امید ہو تو بھی میں ایک قیدی کی حیثیت میں گنتا ہی کی موت کو ترجیح دوں گا۔"

میر حبیب نے کہا: "انسان کے خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں چند ماہ یا چند برس انتظار کر سکتا ہوں۔ اس دوران میں میری کوشش یہ ہوگی کہ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچیں۔ حوالی کے اندر گھومنے پھرنے کی پوری آزادی ہوگی لیکن اگر تم نے جھگڑنے کی کوشش کی تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کر دوں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

معظم علی کمرے سے باہر نکلا اور مسلح سپاہیوں کے ساتھ حدود دار سے کے باہر کھڑے تھے پل دیا۔



علی وردی خاں کی افواج، میدان پور کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ میر جعفر علی وردی خاں کے نیچے میں داخل ہوا۔ ادرتین دفعہ دشمنی سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔ علی وردی خاں کی سز کے پیچھے دو محافظ نئی کواڑیں لیے کھڑے تھے۔ میر جعفر چند تانبے خوف و اضطراب کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر علی وردی خاں نے کہا: "ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ عطار اللہ خاں یہاں حاضر ہونے سے کیوں پس دیش کر رہا ہے؟"

"مالیہ! مجھے معلوم نہیں۔"

اس کی نیت خراب ہے تو ممکن ہے میں اسے یہ سمجھا سکوں کہ تمہاری سازش طشت از باہم ہو چکی ہے اور تمہارے بچاؤ کی اب یہی ایک صورت ہے کہ تم کسی توقف کے بغیر حضور کی خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤ۔“

علی دردی خاں نے کہا: اے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں اگر تم اسے راہ راست پر لائے ہو تو اسے کہو کہ وہ استغفار سے کرمیدھا مرشد آباد چلا جائے۔“
 ”عالیجاہ! اگر میں اسے یہ یقین دلا سکوں کہ آپ نے اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مرشد آباد جانا اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔“
 ”تھیں غلاموں کی سفارش نہیں کرنی چاہیے۔ بہر حال اگر وہ راست پر آجائے تو ہم اس کے لیے معمولی سزا کافی سمجھیں گے۔“



رات کے وقت عطار اللہ خاں اپنی قیام گاہ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے نوکر نے اسے جگایا اور کہا: ”میر جعفر تشریف لائے ہیں اور اسی وقت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔ ان کے ساتھ فوج کے دو افسر بھی ہیں۔“

عطار اللہ خاں پریشانی کی حالت میں لباس تبدیل کیے بغیر نیچے اترا اور ملاقات کے کمرے میں داخل ہوا۔ میر جعفر نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

”تم جا کر سپاہیوں کے آرام کا بندوبست کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“
 فوجی افسر اٹھ کر باہر نکل گئے اور میر جعفر نے عطار اللہ خاں سے کہا: مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی۔ لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کو بروقت خبردار کیا جائے۔“

علی دردی خاں نے کہا: ہمارے خلاف کوئی سازش تمہارے علم کے بغیر نہیں ہوتی۔
 ”عالیجاہ! اگر مجھے اس کی سازش کا علم ہوتا تو میں اس کا سرے کر حضور کی خدمت میں پیش ہوتا۔“

”اس کے سرے کے متعلق ہم بعد میں سوچیں گے۔ فی الحال ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کے عزائم کیا ہیں اور اسے ہماری فوج کی جزاؤں کیسے ہونی اور معظم علی کا آج تک کیوں پتہ نہیں چلا؟“

”عالیجاہ! کنگ کا صوبیدار آپ کو تمام حالات سے آگاہ کر چکا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ فوج کے تمام بڑے بڑے افسر عطار اللہ خاں کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ اگر اس کی نیت بری ہو تو سبھی موجودہ حالات میں حضور کے خلاف کوئی سازش نہیں کر سکتا۔ وہ صرف اپنی جان کے خوف سے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے سے پس و پیش کرتا ہے۔ میں نے حضور کا حکم ملنے ہی معظم علی کے متعلق تحقیقات کی تھی۔ بد قسمتی سے جس دن وہ کنگ سے روانہ ہوا تھا۔ میں وہیں تھا اور میں نے اسے یہ کہا تھا، کہ تم آٹھ آدمیوں کے ساتھ سفر کرنے کی بجائے فوج کا انتظار کرو اور میرے اس مشورے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے سرحد کے آس پاس مرہٹوں کی سرگرمیوں کی اطلاع مل چکی تھی۔ لیکن معظم علی ایسے مشورے سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ مارا گیا ہے یا قید ہو گیا ہے۔ بہر حال وہ کنگ سے میرے سامنے روانہ ہوا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عطار اللہ خاں نے اس کے خلاف کوئی سازش کی ہو لیکن یہ ثابت کرنا آسان نہیں۔“

علی دردی خاں نے قدرے نرم ہو کر سوال کیا: ”عطار اللہ خاں کے متعلق تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

”عالیجاہ! میرا خیال ہے وہ ڈر کے مارے حضور کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ میری یہ درخواست ہے کہ حضور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دے اگر

وہ ایک دوسرے کے سامنے کریوں پر بیٹھ گئے۔ عطار اللہ خاں کچھ دیر انتہائی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں جھڑکی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے ہیں۔ مجھے میدانِ پور میں علی وردی خاں کی آمد کی اطلاع ملے ہی یہ خدمت پیدا ہو گیا تھا کہ ہمارے کسی ساتھی نے انہیں ہمارے ارادوں سے خبردار کر دیا ہے۔ میرے جعفر نے کہا مجھے اس بات کا یقین نہیں، لیکن آپ سے ایک غلطی ضرور ہوئی ہے اور وہ یہ کہ آپ علی وردی خاں کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ میرا آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میدانِ پور میں علی وردی خاں کی غیر متوقع آمد کے بعد ہماری سازش کی کامیابی کے امکانات بہت محدود ہو چکے ہیں۔ اس کے شکر کا مقابلہ کرنا خوشی کے مترادف ہوگا۔ اگر وہ ملک پہنچ گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی فوج کے بیشتر سپاہی اپنی شکست کو یقینی سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ آپ کے لیے اب ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ کہ استغفا دے کر مرشد آباد روانہ ہو جائیں۔ میں نے علی وردی خاں کو آپ کی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی اور انہوں نے یہ کہا تھا کہ اگر آپ مستعفی ہو کر مرشد آباد چلے جائیں تو آپ پر کوئی سستی نہیں کی جائے گی۔"

عطار اللہ خاں کچھ دیر پٹی پٹی نگاہوں سے میرے جعفر کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا:

علی وردی خاں نے آپ سے بھی استغفا کا مطالبہ کیا ہے؟

نہیں اور اگر آپ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تو شاید یہ صورت پیدا نہ ہوتی۔ عطار اللہ خاں نے جواب دیا: میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی بجائے مرشد آباد کی پناہ لینا بہتر سمجھتا ہوں۔ میرے صاحب آپ یوں ہی گھبرا گئے ہیں۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میں اسی وقت فوج کو کوچ کا حکم دیتا ہوں۔ میرے صیب سرحد سے زیادہ دور نہیں۔ ہمیں اسے کی پناہ لے کر علی وردی خاں کے ساتھ جنگ کے لیے تیاری کا وقت مل

جائے گا۔

میرے جعفر نے جواب دیا: میں یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔ میرے صیب ایک ڈاکو ہے۔ اور اس کی دوستی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بنگال کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھانے کی امید پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے اور وہ بھی اسی صورت میں جب کہ اسے آپ کی کامیابی کا یقین ہو۔ لیکن جب آپ ایک شکست خوردہ آدمی کی حیثیت میں اس کے پاس جائیں گے تو وہ آپ کو چند لمحوں کے عوض میں علی وردی خاں کے ہاتھ ذرخت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آپ اگر مستعفی نہ ہوئے تو بھی علی وردی خاں آپ کو سبکدوش کر دے گا۔ اس لیے میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ آپ ابھی انہیں یکے کے بعد بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ میں آپ کا اعتماد کھو چکا ہوں اور میرے مخالفین آپ کو بھگن کرنے کے لیے میرے متعلق ہی قسم کی افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ میں آپ کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں مستعفی ہو جاؤں اور آپ سے یہ درخواست کروں کہ مجھے مرشد آباد میں اپنی زندگی کے باقی ایام گزارنے کی اجازت دی جائے لیکن اگر آپ کو کسی دقت میری نیک نیتی کا یقین آجائے تو مجھے ہر وقت اپنی خدمت کے لیے تیار رہیں گے۔

عطار اللہ خاں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: میرے صاحب آپ کو یقین ہے کہ استغفا دینے کے بعد مرشد آباد جانا میرے لیے خودکشی کے مترادف نہیں ہوگا؟

نہیں! بلکہ مجھے یہ یقین ہے کہ آپ کو مرشد آباد پہنچتے ہی علی وردی خاں کا یہ بیخاں ملے گا کہ ہمارے تمام شکوک دور ہو چکے ہیں اور تمہیں فلاں عہدہ پر مامور کیا جاتا ہے۔ عطار اللہ خاں نے کہا: مجھے یقین نہیں آتا کہ میں اتنی جلدی بازی ادا کر سکتا ہوں۔ میرے جعفر نے تسلی دیتے ہوئے کہا: میرے دوست آپ نے بازی نہیں ہاری۔

تمہارا استغفا منظور کر لیا ہے۔ بابت غلطیوں کے بارے میں تم سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتے گی۔ لیکن آئندہ کے لیے تمہیں بے حد محتاط رہنا چاہیے!

اور علی دردی خاں اس کے جواب میں کہہ رہا تھا: ہاں، اور اسے یہ بھی لکھ دو کہ اس کی سابقہ فوجی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے گزارے کے لیے ایک معقول وظیفہ دیا جائے۔

علی دردی خاں اپنی عمر کی آخری منزل میں قدم رکھ چکا ہے۔ مستقبل ہمارا ہے اور ہم چند مہینے یا چند برس اور انتظار کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی شکست کا اعتراف کرنے یا ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دینے نہیں آیا بلکہ یہ مشورہ دینے کے لیے آیا ہوں کہ آپ ہتھیار اٹھانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں:

عطاء اللہ خاں نے کہا: میرا صاحب! جب ہم اپنے مستقبل کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے تو آپ نے مجھے یہیں بتایا تھا کہ مجھے کبھی صورتِ حالات کا سامنا ہی کرنا پڑے گا۔ اب اگر آپ کا یہی مشورہ ہے تو میں استغفا دینے کے لیے تیار ہوں لیکن اسٹے کا جواب آنے تک میرا یہاں رہنا ضروری ہوگا۔ پھر اگر علی دردی خاں نے مجھے مرشد آباد جانے سے منع کر دیا تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟

آپ کو جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بیچا ہتا ہوں کہ آپ استغفیر حوالے کریں، اور کسی تاخیر کے بغیر مرشد آباد روانہ ہو جائیں۔ علی دردی خاں کو مطمئن کرنا میرا کام ہوگا۔ عطاء اللہ خاں نے اسٹے کو دھڑلے کے قریب جا کر ڈکڑ کو آواز دی اور کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا۔ اور پھر میرے صبر کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "میرا صاحب! اسٹے کا مضمون لکھنے کے لیے مجھے آپ کی مود کی ضرورت ہے۔"

بہت اچھا! میں بولتا جاؤں گا اور آپ کہتے جائیں:

دوسرے روز علی الصباح عطاء اللہ خاں مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا اور اس کی روانگی کے چند دن بعد مر جعفر میمنہ پور پہنچ کر علی دردی خاں سے یہ کہہ رہا تھا: "عالیجاہ! خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری باتیں میں اگر استغفا سے دیا، ورنہ اس کے عزام بہت خطرناک تھے، مرشد آباد میں وہ حضور کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ہمارے جاسوس بر وقت اس کی غلطی کے لیے موجود ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی نادان دوست نے بہکایا تھا۔ اب اگر حضور کی مہارت ہو تو میں اسے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضور والا نشان نے

ساتواں باب

میر حبیب کی قید میں معظم علی کے لیے زندگی صبح و شام کے ایک بے کیفیت تسلسل کا نام تھی۔ اسے بنگال کے حالات کا کوئی علم نہ تھا۔ قید کی تنہائی میں اکبر خاں اس کے لیے ایک بہت بڑا سہارا بن چکا تھا۔ وہ اکثر اپنے اپنے خاندان، عزیزوں اور دوستوں کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ذہنی کرب کے باعث معظم علی کئی کئی گھنٹے خاموش رہتا اور اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا: "بھائی جان! آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ خدا ہماری مدد کرے گا اور ہم بہت جلد ان ظالموں کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ آپ کہتے تھے کہ خدا اپنے بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔ میں بردقت آپ کی رہائی کے لیے دعائیں مانگا کرتا ہوں۔ آپ کہتے تھے خدا اپنے بندوں کے صبر کا امتحان لیتا ہے۔ لیکن آج آپ مفوم ہیں۔"

جب مکرانے کی کوشش کے باوجود اکبر خاں کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں تو معظم علی خواب و خیال کی دنیا سے نکل کر اسے تسلی دینے کی ضرورت محسوس کرتا۔ "اکبر میں اپنے متعلق نہیں، بلکہ اپنی قوم اور اپنے وطن کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

پھر وہ آپس میں بار بار کی ہوئی باتیں دہراتے اور حال کی مایوسیوں کے اندھیروں میں مستقبل کی امیدوں کے چراغ جھانے کی کوشش کرتے۔ اکبر خاں اپنے وطن کے حسین

اور دلکش مناظر بیان کرتا اور معظم علی اسے مرشد آباد کی ان گلیوں اور مکانات کے متعلق بتاتا جہاں وہ بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ پھر وہ قید سے آزاد ہونے کے بعد ایک دوسرے کا وطن دیکھنے کا وعدہ کرتے۔

اکبر خاں اپنی عمر کے عام بچوں کی نسبت کہیں زیادہ سنجیدہ اور ذہین تھا۔ وہ معظم علی کو اس حویلی کے اندر اور باہر مڑوں کے کیمپ کے تمام حالات بتا چکا تھا۔ فزائی کی کوشش سے پہلے جب اسے ادھر ادھر گھومنے کی آزادی تھی وہ پڑاؤ کے متعلق تمام معلومات چل کر چکا تھا۔ وہ معظم کو بتا چکا تھا کہ مہیٹے گاؤں کے اہل باشندوں کو نکالنے کے بعد ان کے مکانات پر قبضہ کر چکے ہیں بیشتر مکانات ان کے گھوڑوں کے لیے اصطبلوں کا کام دیتے ہیں اور بعض مکانات میں انھوں نے گولہ بارود اور رسد کے ذخیرے جمع کر رکھے ہیں، پہریدار کی ٹولیاں دن رات گاؤں کی گلیوں میں گشت کرتی ہیں۔ گاؤں کے باہر چاروں طرف مرثبہ سپاہیوں کے خیمے ہیں۔ اس حویلی کی چار دیواری کے اندر بھی بعض کوٹھڑیوں کے تہہ خانوں میں رسد اور بارود کے ذخیرے جمع ہیں۔

اکبر خاں سے متعدد سوالات پوچھنے کے بعد معظم علی کو اپنی کوٹھڑی سے باہر ہر دیوار، برگی اور ہر مکان کا نقشہ حفظ ہو چکا تھا صبح شام انھیں تنہائی دیر ہوا خوری کے نیلے قید خانے سے باہر نکالا جاتا۔ معظم علی حویلی کے اندر دوسرے قیدیوں کے علاوہ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں سے ملتا لیکن مسلح پہریدار بردقت اس کے سر پر موجود ہوتے اور اسے کسی سے بات کرنے کا موقع نہ دیتے۔

ایک دن اکبر خاں فزاد ہونے کے متعلق اسے اپنی نئی تجویز بتا رہا تھا۔ معظم علی دیر تک اس کی باتیں سنتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "اکبر خاں تمہیں معلوم ہے کہ بھاگنے کی ناکام کوشش ہمارے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہوگی۔ پھر میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر ہم اس کوٹھڑی سے باہر رہ کر گردش کے حالات معلوم کر سکیں تو شاید

ہم بھاگنے کے متعلق کوئی بہتر تجویز سوچ سکیں۔ میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ اگر تم نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تو ممکن ہے ہم بہت جلد رہا ہو جائیں۔

اگلے دن پھر ملہ رکھانے کو آیا تو معظم علی نے اس سے کہا: "میں میرے حبیب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

پہریدار نے جواب دیا: "وہ یہاں نہیں ہیں جب وہ آئیں گے تو آپ کی درخواست پسپا دی جائے گی۔"

معظم علی انتہائی بے چینی سے میرے حبیب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ روزانہ صبح اٹھتا اور پہریدار سے پوچھتا مگر اسے نفی میں جواب ملتا۔

کوئی دس ماہ انتظار کے بعد پہرے داروں کے ایک افسر نے اس کے پاس آکر اطلاع دی کہ میرے حبیب تشریف لائے ہیں اور آپ کی درخواست ان تک پہنچا دی گئی ہے لیکن ابھی تک انہوں نے مجھے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

معظم علی نے مایوسی اور بے بسی کی حالت میں چند دن اور گزارے۔ ایک دن اچانک اس کی کوٹھری کا دروازہ کھلا اور میرے حبیب فوج کے دو افسروں اور چار مسلح سپاہیوں کے ہمراہ کوٹھری کے اندر داخل ہوا۔ معظم علی اور اکبر خان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

میرے حبیب نے سوال کیا: "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں یہ سمجھتا تھا کہ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود آپ ایک بہادر آدمی ہیں۔ لیکن بہادری اور بے رحمی میں بہت فرق ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس معصوم بچے نے کیا گناہ کیا ہے۔ اور آپ اسے کب تک قید میں رکھنا چاہتے ہیں؟"

میرے حبیب نے جواب دیا: "ایک قیدی کو دوسرے قیدی کی سفارش کا حق نہیں۔ تاہم ذاتی طور پر میری یہ خواہش دہی کہ اکبر کو کوٹھری میں بند کیا جائے۔ لیکن اس نے بھاگنے کا کوشش کی تھی، اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس کی شکل دیکھ کر دم آگیا تھا۔"

معظم علی نے اکبر خاں کی طرف دیکھا اور اس نے اگلے بڑھ کر میرے حبیب کا دامن پکڑتے ہوئے کہا: "مذاک کے لیے میرا قصور معاف کر دیجیے۔ اب اگر میں بھاگنے کی کوشش کر دوں تو مجھے گولی مار دیجیے۔"

میرے حبیب نے کہا: "میرا خیال تھا کہ تم یہاں خوش ہو۔"

نہیں! نہیں! اکبر خاں نے جواب دیا: "میں کھلی ہوا میں رہنا چاہتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا وطن کس سمت ہے لیکن اگر یہ بھاگ بھی جائے تو آپ سے بے کون سے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے؟"

میرے حبیب نے کہا: "دیکھو اکبر! میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی تو تمہیں باقی تمام عمر اس بہ خانے میں رکھا جائے گا۔ جہاں دوپہر کے وقت بھی روشنی نہیں پہنچتی۔"

پھر وہ پہریداروں کی طرف متوجہ ہوا: "اسے سے جاؤ! لیکن اس کا اچھی طرح خیال رکھو! اکبر خاں ایک پہریدار کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میرے حبیب دروازے کے قریب پہنچ کر اچانک مڑا اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "میرا خیال تھا کہ تم اپنے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"اپنے متعلق میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک ایسے شخص کی قیدی ہوں جس سے رحم یا انصاف کی درخواست کرنا بے سود ہے اور میں اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب انصاف کی توار میرے ہاتھ میں ہوگی۔"

میرے حبیب غصے میں آنے کی بجائے مسکرایا اور اس نے سوال کیا: "جب انصاف کی توار تمہارے ہاتھ میں ہوگی تو تم کیا کر دو گے؟"

"میں آپ کو اس سے بہتر کوٹھری دل گا اور آپ کے ساتھ کوئی ایسا قیدی نہیں رکھوں گا جس کی مظلومیت اور بے بسی کے احساس سے آپ اپنی تکالیف بھول جائیں۔"

”تم بیوقوف ہو۔ ایسا دقت کبھی نہیں آئے گا۔“ میر حبیب یہ کہہ کر نکل گیا۔



قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے حویلی کے صحن میں تین چھولدریاں نصب تھیں۔ درمیانی چھولدری ذرا بڑی تھی جس میں قیدیوں کے محافظوں کا جھنڈا لڑھکتا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو چھولدریوں میں آٹھ سپاہی رہتے تھے۔ گرمی کے موسم میں قیدیوں کے محافظ دن کے وقت ان چھولدریوں میں پناہ لیتے تھے۔ لیکن رات کے وقت وہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے دروازوں کے سامنے کھلی فضا میں آرام کرتے تھے۔ دو دروازوں کی چار ٹوئیاں رات کے وقت باری باری قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے گشت کرتی اور شام سے صبح تک برتن گھسنے کے بعد پھر بدلتا تھا۔ اس چکی کے دوسرے محافظ جن کی تعداد عام طور پر پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہوتی تھی بڑے دروازے کی طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں اور بانس کے چھروں میں رہتے تھے۔

میر حبیب نے اکبر خاں کو معظم علی کی کوٹھڑی سے نکال کر قیدیوں کے محافظ سپاہیوں کے جھنڈا کے سپرد کر دیا تھا اور اسے تاکید کی تھی کہ اکبر خاں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ جھنڈا ایک مرہٹہ تھا اور اس کا نام مرلی دت تھا۔ مرلی دت بے حد مڑھتا تھا۔ وہ مڑھ گھٹا تھا اور اس کے سیاہ چہرے پر چمپک کے داغ تھے۔ دو سال قبل وہ میر حبیب کی فوج کے اچھے سپاہیوں میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن ایک لڑائی میں زخمی ہونے کے باعث اس کی بائیں ٹانگ بیکار ہو چکی تھی۔ اپنے ماتحت سپاہیوں کے ساتھ وہ بڑی سختی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ لیکن اکبر خاں کے ساتھ اس کا برتاؤ نسبتاً بہتر تھا۔ اس نے اکبر خاں کو قید خانے کی کوٹھڑی سے نکلانے کے بعد اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا: میں نے اس سے پہلے بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ لیکن تم نے بھاگنے کی کوشش کی۔ میر صاحب نے تمہیں ایک موقع اور دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب بھی تمہیں کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی تو تمہارا

انجام بہت بڑا ہوگا۔“

اکبر خاں نے انتہائی مصومیت کے انداز میں جواب دیا۔ جی میں آئندہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔“

”تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم کوئی شرارت نہ کرو!“

چند دنوں کے اندر اکبر خاں، مرلی دت کے لیے ایک کارآمد نوکر بن چکا تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر چھولدری میں جھاڑو دیتا۔ اس کا بستر درست کرتا اور کبھی کبھی اس کے کپڑے بھی دھو لاتا۔ سپاہی اس پر اس لیے خوش تھے کہ پہلے اس قسم کے تمام کام انہیں کرنے پڑتے تھے۔

مرلی دت کو بانسری بجانے اور اس سے زیادہ سننے والوں سے داد حاصل کرنے کا شوق تھا۔ لیکن اس کے چند سپاہیوں کے علاوہ جیسے ایک مجبوری سمجھ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے، قلعے میں کسی اور کو اس کے اس فن سے دلچسپی نہ تھی بلکہ دوسرے سپاہی اور افسر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ بانسری بجانے کے علاوہ اسے گانے کا بھی شوق تھا۔ لیکن برہمنی سے اس کی آواز اس کی صورت سے بھی زیادہ کریمہ تھی۔

اکبر خاں کو اس کی کمزوری کا علم تھا اور وہ جی کھول کر اسے داد دیا کرتا تھا۔ وہ کہتا: ”بچا مرلی دت! آپ! آپ تو کمال کرتے ہیں۔ میں نے کسی اور کو اتنی اچھی بانسری بجانے نہیں دیکھا۔“

اور وہ جواب دیتا: ”اے مجھے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور تم ان سب سے زیادہ سمجھدار ہو۔“

بچا مرلی دت! آپ کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔ کاش میں بھی اس طرح کا سکتا! اور مرلی دت خوش ہو کر کہتا: گانے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے بیشا۔ آہستہ آہستہ اکبر خاں پر مرلی دت کا اعتماد بڑھتا گیا۔ اسے حویلی کے اندر رکھنے کی آزادی

کچھ نہیں! چچا مرلی دت بن بھار ہا ہے اور مجھے نیند نہیں آتی؛

پھر میرا نے اس کے قریب آکر کہا: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ توپ کی آواز بھی اس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو مرلی دت کے ساتھ چھو لڑائی میں ہونے کی بجائے ترخانے میں رہنا زیادہ پسند کرتا۔ لیکن دیکھو یہ بات کہیں اس سے نہ بکھر دینا!

دوسرے سپاہی نے کہا: جی! اگر خاں! پرچہ بتاؤ تمہیں واقعی ان کا گناہ پسند ہے؟ آدھی رات تک وہ بانسری بجھتے رہے اور پھر جب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اب تھوڑی دیر سونے کے لیے وقت مل جائے گا تو تم گھنٹے کے لیے اصرار کرنے لگے:

ان کا گناہ مجھے بہت پسند ہے۔ اگر خاں نے کھاٹ پر لیٹے ہوئے جواب دیا۔

صبح کے وقت پھر میرا نے اگر خاں کو جگایا اور کہا: جاؤ چابیاں لے آؤ!

اگر خاں اٹھیں مگر ہوا چھو لڑائی میں داخل ہوا تو مرلی دت بدستور خانے لے رہا تھا۔ اس نے مرلی دت کو جگنے کی بجائے آگے بڑھ کر اطمینان سے دھلاگے کی گرہ کھولی اور اس کے گلے سے چابی اتار لی۔ پھر اس نے صندوق کا تالا کھولا اور تید خانے کی چابیوں کا گچھا لے کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کھاٹ چھو لڑائی کے اندر لے آیا۔ اور اس پر لیٹے ہی گری نیند سو گیا۔

اچانک اسے مرلی دت کی آواز سنائی دی: "اگر خاں! اگر خاں!! بہت دیر ہو گئی۔ جاؤ پھر میرا روں کو چابیاں دے آؤ۔ مجھے رات نیند نہیں آتی؛ اگر خاں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

مرلی دت نے اپنے گلے اور سینے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد بدستور اسے ہو کر کہا: ارے میری بی کہاں گئی؟

اگر خاں نے اپنے گلے سے چابی اتار کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہہ دیجئے، میں نے

تھی۔ جب قیدیوں کو تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑیوں سے باہر نکالا جاتا تو وہ کسی کسی بہانے ان کے پاس چلا جاتا۔ پھر یاروں کی موجودگی میں اسے عام طور پر منظم علی سے باتیں کر کے ہاتھ زلزلتا۔ لیکن جب کبھی سپاہیوں کی توجہ دوسری طرف ہوتی تو وہ آہستہ سے کوئی بات کہہ کر نکل جاتا۔

جب سپاہی قیدیوں کے لیے کھانا لے کر آتے تو وہ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے کبھی روٹیوں کی توکری اور کبھی پانی کا ٹھکڑا پکڑ لیتا۔ آہستہ آہستہ پھر میرا اس سے اس قسم کے کام لینے کے عادی ہوتے گئے۔ پانچ چھ ہفتوں کے بعد یہ حالت تھی کہ جب قیدیوں کو کھانا پہنچانے کا وقت آتا تو سپاہی اسے کبھی گنوں سے پانی اور کبھی ترخانے سے کھانا لانے کے لیے کہتے۔

کوٹھڑیوں کے تالوں کی چابیاں مرلی دت ہمیشہ اپنے قبضے میں رکھتا تھا۔ رات کے وقت قیدیوں کو کھانا دینے کے بعد وہ چابیوں کا گچھا چھو لڑائی کے اندر ایک کڑی کے صندوق میں بند کر دیتا تھا۔ اور صندوق کے تالے کی چابی جو ایک دھلاگے میں بندھی ہوتی تھی۔ اپنے گلے میں ڈال لیتا تھا۔ پھر یار ہر صبح قیدیوں کو باہر نکالنے کے لیے مرلی دت سے چابیاں لینے آتے تھے۔ ایک دن اس کی طبیعت ذرا خراب تھی۔ اس نے اپنے لیٹے اگر خاں کو صندوق کی چابی دیتے ہوئے کہا: جاؤ تم نکال دو!"

یہ ابتدا تھی اور اس کے بعد اگر خاں مستقل طور پر یہ کام اپنے ذمے لے چکا تھا۔

ایک رات ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مرلی دت کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر بانسری بجنا رہا اور اس کے بعد اپنی موٹی اور بھاری آواز میں اگر خاں کو چند گیت سنانے کے بعد لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گری نیند میں اس کے خراٹے جھونکے کے تقریباً ہر سپاہی اور افسر کے لیے موضوع بحث بن چکے تھے۔ اگر خاں کو پریشان کر رہے تھے۔ پچھلے پھر جب بارش تم گئی تو اگر خاں نے اپنی کھاٹ چھو لڑائی سے باہر نکال لی۔

دو پھر میرا گشت کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا: کیوں اگر خاں کیا بات ہے؟

بعد نکلا گا کر باہر نکل آیا۔

”کیسے بیوقوف ہو“ مرلی دت نے جھنجھلا کر کہا ”تم میرا صندوق توڑ ڈالو گے“

اکبر خاں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: چچا! اندر بہت گرمی ہے۔ دیکھو مجھے پسینہ آرہا ہے۔

”آج بارش ضرور آئے گی“ اس نے اکبر خاں کے ہاتھ سے چابی لے کر گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اکبر خاں مرلی دت کے سامنے دوسری کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اس پاس لیٹے ہوئے سپاہیوں کو آواز دے کر کہا:

”بھئی یہاں آؤ! آج چچا مرلی دت کمال کر رہے ہیں! اور سپاہی مرلی دت کی موسیقی سے بظن اندوز ہونے کی بجائے اس کے عتاب سے بچنے کے لیے اپنی اپنی کھاٹ گھسیٹ کر اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔

مرلی دت نے کہا: راگ سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ اب ذرا غور سے سنو۔ اور وہ کوئی ایک گھنٹہ انتہائی بیچارگی کی حالت میں بیٹھ رہے۔ اچانک بارش کی موٹی موٹی ہڈیں گرنے لگیں۔ بادل گر جا اور موسلا دھار زمین پر سنے لگا۔

اکبر خاں نے کہا: چچا مرلی دت بارش آگئی اُٹھیے۔ آپ کی کھاٹ اندر کر دوں؟ اور وہ بستور بانسری بجاتا ہوا چھو لہاری کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر اکبر خاں اور مرلی دت چھو لہاری کے اندر اپنی اپنی کھاٹ پر لیٹے رہے مرلی دت بانسری بجلنے کی بجائے ایک انتہائی ناقابل برداشت نے میں گا رہا تھا۔ وہ گاتے گاتے سو گیا اور پھر اس کے خزانے تاریک رات کی ہولناکی میں اضافہ کرنے لگے۔

اکبر خاں کے دل کی دھڑکنیں دوبارہ تیز ہونے لگیں۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ بالآخر اٹھا اور کھاٹ سے اتر کر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل فرش پر چلتا ہوا صندوق کے پاس پہنچا۔

پہر پلہ دی کو چابیاں نکال دی ہیں۔ آپ گرمی خیز سود ہے تھے۔ اس لیے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

”تم بہت شریر ہو!“ مرلی دت نے چابی کا دھاگا اپنے گلے میں ڈالتے ہوئے کہنا لگا۔

”اب بے فینڈا رہی ہے؟“ اکبر خاں نے کھاٹ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

اس واقعہ سے چند ہفتے بعد صبح کے وقت قیدیوں کو کوٹھڑیوں سے باہر نکالا گیا تو اکبر خاں نے موقع پر مکر معلوم علی سے کہا: میرے عیب کل کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کی تیر حاضری میں پہرہ سخت نہیں ہوتا۔ بادل آ رہے ہیں مگر آج رات بارش شروع ہو گئی تو آپ تیار رہیں؟



شام کے وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مرلی دت چھو لہاری کے باہر کھاٹ پر بیٹھا اطمینان سے بانسری بجاتا تھا۔ اکبر خاں پہر پلہوں کے ساتھ قیدیوں کو کھانا تقسیم کرنے کے بعد اس کے پاس آیا اور اس نے چابیوں کا گچھا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: چچا مرلی دت آج بہت گرمی ہے۔ میں نے سانسے کر بعض راگیناں بارش لے آئی ہیں۔ آپ کو کئی ایسا راگ آتا ہے؟

مرلی دت نے بے پردائی سے جواب دیا: راگ آؤمی کے لیے ہوتے ہیں۔ بادلوں کے لیے نہیں۔ اور پھر بانسری بجلنے میں مصروف ہو گیا۔

اکبر خاں نے قہر سے توقف کے بعد کہا: چچا مرلی دت چابیاں اندر رکھ آؤں؟

مرلی دت نے جواب دینے کی بجائے اپنے گلے سے صندوق کی کنجی نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اکبر خاں چابیوں کا گچھا لے کر اندر چلا گیا۔ اس کا دل تیری طرح دھڑک رہا تھا۔ چند لمبے وقف کے بعد اس نے چابیوں کا گچھا صندوق کے پیچھے رکھ دیا۔ پھر اس نے صندوق کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے بعد نکلا کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے

جسے کوئی ٹوٹنے آئے گا۔ ہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد چکر لگاتے رہیں گے۔
وہ چلے گئے۔

اکبر خاں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چابی لگ گئی۔ اس نے تالا کھلا
کر کھڑی تار اور آہستہ سے کواڑ کے پٹ اندر کی طرف دھکیل دیئے۔

”بھائی جان! بھائی! اس نے دبی زبان میں کہا۔
”بکر آہستہ بولو!“ معظ علی نے اس کا بازو پکارتے ہوئے کہا۔

اکبر خاں نے کہا: ”پیرا چھو لاری کے اندر چلے گئے ہیں۔“
”میں جانتا ہوں۔ آؤ ہم اسے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔“

اکبر خاں نے چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ”یہ لیجیے! اگر پیرا چھو لاری
نہ آگئے تو ہم تمام کو ٹھٹھیاں کھول سکے ہیں۔“

معظ علی نے باہر نکل کر دروازے کو کھڑی لگا دی اور کہا: ”اس کا تالا کہاں ہے؟“
اکبر خاں نے جواب دیا: ”وہ میں نے چھت پر پھینک دیا ہے۔“

معظ علی جلدی سے آگے بڑھ کر دوسری کوٹھڑی کا تالا کھولنے میں لگ گیا۔ چند چابیاں آزمائیں
کے بعد اس نے تالا کھول لیا۔ کوٹھڑی کے اندر اس کے دو ساتھی منتظر تھے۔ اس نے چابیوں
کے گچھے کی رسی کھینچ کر توڑ ڈالی اور اپنے ساتھیوں کو چابیاں تقسیم کرتے ہوئے کہا: ”تم ان چابیوں
سے جن کو ٹھٹھروں کے تالے کھول سکو وہاں سے قیدیوں کو نکال کر میری کوٹھڑی میں جمع کرو۔ اور
دروازے اسی طرح بند کرتے جاؤ۔ اور دیکھو ہمیں اپنے ساتھیوں کے علاوہ دوسرے قیدیوں
کو بھی یہاں سے نکالنا ہے۔“

چند منٹ میں معظ علی کے آٹھ ساتھیوں کے علاوہ بارہ اور قیدی اس کی کوٹھڑی میں جمع
ہو چکے تھے۔ صرف آخری سرے پر تین کوٹھٹھیاں باقی تھیں جن کے اندر پانچ پانچ قیدی
بند تھے۔

مندوق کے پیچھے چابیوں کے گچھے کو ہاتھ لگنے سے ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور اس کے
جسم میں خون کا ہر قطرہ بجمد ہو کر رہ گیا۔ لیکن مرلی دت کے غرائز کے تسلسل نے اس کے توہمات
دور کر دیئے۔ وہ مڑا اور اسی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا چھو لاری کے دروازے
پر کھڑا ہو کر باہر چلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد پانی اور کھیر میں دو پیرا چھو لاری کے پادوں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ قیدیوں
کی کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اکبر خاں دے پادوں معظ علی کو
کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ وہ کوٹھڑی کے تالے میں کیے بعد دیو گے غفلت چابیاں لگانے کی کوشش
کر رہا تھا کہ سپاہیوں کے قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دینے لگی۔ وہ دروازے کے ساتھ چوٹ
کر کھڑا ہو گیا۔ خوف دہرا اس کے باعث اس کی یہ حالت تھی کہ اسے اپنا سانس بھی بارے محسوس ہوتا
تھا۔ بجلی کی ایک ہلکی سی چمک ان تمام منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی تھی جو اس نے مبینوں کے
غور و خور کے بعد تیار کیے تھے۔

ایک پیرا چھو لاری اپنے ساتھی سے کمرہ لگا تھا۔ ”بھئی چلیں اپنی چھو لاری کے اندر۔ یہ طوفان بہت
خطرناک ہے۔“

”شہر! میں ابھی آتا ہوں۔“ دوسرے نے جواب دیا۔

”کہا، جدت۔“

”ذرا جمعہ دار صاحب کا حال دیکھ آؤں۔“

ایک پیرا چھو لاری سے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر لگ گیا اور دوسرا مرلی دت کی
چھو لاری کی طرف بڑھا۔

چند منٹ بعد وہ ہنستا ہوا واپس آیا اور بولا: ”جو بھئی! جمعہ دار جی کو اس وقت دنیا کی کوئی
خبر نہیں ہے۔ ہم اپنی چھو لاری کے اندر بیٹھے ہیں۔ یہ کجست خود بخود جینے کی طرح سوتا ہے اور
یہ ایسی بارش میں بھی سر چھپانے کی اجازت نہیں دیتا۔ آخر ان کو ٹھٹھروں میں کون سا سفر ایشیہ

میں جب تمام قیدی معظ علی کی کوٹھڑی میں جمع ہو گئے تو اس نے اکبر خاں سے کہا: اکبر! تم نے
میں قید سے نکالا ہے۔ اب باہر نکلنے کے لیے بھی میں تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔
اکبر خاں نے جواب دیا: حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنا ممکن نہیں۔ یہاں سے نکلنے کے
صرف دو ہی راستے ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم یا تو پچھلی دیوار میں نقب لگا کر نکل سکتے ہیں یا
پچھلے دروازے کی طرف دوسری حویلی میں کود جائیں۔ پچھلے دروازے کی حویلی میں نکلنے کے گودام اور گھوڑوں
کے اصطبل ہیں۔ وہاں اس وقت پندرہ بیس پہریاڑ ہوں گے۔ ہمارے پاس صرف دو بندو قیں
اور دو تلواریں ہیں۔ میں مرلی دت کی بندوق، توار، پستول اور بالاد کا تھیلہ بھی لاکر آپ کو لے
سکتا ہوں۔ لیکن اگر ہم اچانک ان خیموں پر حملہ کر کے پہریاڑوں کو مغلوب کر لیں تو ہم چند بندوقیں
اور تلواریں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ساتھ دلی حویلی کے پہریاڑوں کو مغلوب کرنا ہمارے
لیے آسان ہوگا۔

معظ علی نے جواب دیا: "نہیں! ہمارے لیے دوسری حویلی سے ہتھیار حاصل کرنا زیادہ
آسان ہوگا۔ ان کوٹھڑیوں کی چھت زیادہ اونچی نہیں اور ہم آسانی یہاں سے نکل سکتے ہیں۔
اکبر خاں! سب سے پہلے تمہاری باری ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔"
کوٹھڑی سے باہر نکل کر معظ علی نے دیوار کے قریب جھکے ہوئے کہا: تم میرے کندھے پر
سوار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔

اکبر خاں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن اس کے ہاتھ چھت کی منڈیر تک نہ پہنچ
سکے۔ معظ علی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے گھٹنے پکڑ کر اپنے بازو ادا پھاڑے اور اکبر
منڈیر پکڑ کر چھت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد معظ علی نے اسی طرح ایک اور آدمی کو چھت پر چڑھایا اور پھر باقی تمام آدمیوں
کو اسی طریقے پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ ان کی آن میں تمام آدمی چھت پر چڑھ گئے۔ نیچے آخری آدمی
معظ علی تھا۔ دو آدمیوں نے اپنی پگڑیوں کا رستہ بنا کر نیچے لٹکا دیا۔ معظ علی نے بڑے اطمینان

معظ علی نے ایک کوٹھڑی کا تالا ابھی کھولا ہی تھا کہ اکبر خاں جھانکنا ہوا آیا اور اس نے
کہا: پہریاڑ گشت کے لیے آ رہے ہیں۔
معظ علی نے جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور اکبر خاں کا بازو پکڑ کر فوراً اندر داخل ہو گیا
قیدی دروازے پر منتظر تھے۔ معظ علی نے دروازہ بند کرتے ہوئے اکبر خاں سے دریافت کیا۔
پہریاڑ کتنے ہیں؟
صرف دو۔ اس نے جواب دیا۔

معظ علی نے کوٹھڑی کے قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہا: تم میں سے تین مضبوط آدمی میرے
ساتھ آجائیں۔ ہم پہریاڑوں کو چیخ پکار کا موقع دیتے بغیر اس کوٹھڑی میں بند کریں گے۔ لیکن یاد
رکھو۔ تمہاری ذرا سی کوتاہی ہمارا تمام منصوبہ خاک میں ملا دے گی۔

اس کے بعد معظ علی نے دروازہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر میں پہریاڑوں کے قدموں کی چاپ
سنائی دینے لگی۔ جوں ہی وہ باتیں کرتے ہوئے کوٹھڑی کے سامنے پہنچے۔ معظ علی اچانک آگے
بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے ایک کا لگا کر دبوچ کر کوٹھڑی کے اندر گھسیٹ لایا۔ دوسرے آدمی کے
منہ سے صرف "کیا ہے" نکلنے پایا تھا کہ ایک قیدی نے بڑھ کر اس کی گردن دبا لی اور باقی دو نے
اسے گھونسوں اور ٹکوں سے ادھ موا کر کے کوٹھڑی کے اندر ڈال دیا۔

تاریکی میں معظ علی کو یہ بتانے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ کوٹھڑیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا
جائے۔ کوئی ان کی تھیں پھاڑ کر ان کے منہ میں گھونس رہا تھا تو کوئی ان کی پگڑیاں اتار کر ان
کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں مصروف تھا۔ اور کوئی لاقوں اور ٹکوں سے ان کی توجہ کرنے میں
لگا ہوا تھا۔

معظ علی نے کہا: "جانی! کیسنا اندھیرے میں اپنے کسی ساتھی کو نہ مار دینا!"
پہریاڑوں کی بندوقوں اور تلواریں پر قبضہ کرنے کے بعد معظ علی قیدیوں کو لے کر باہر نکلا
اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا۔ باقی دو کوٹھڑیوں سے قیدیوں کو نکالنے میں اسے دیر

کے سامنے جمع ہو گئے۔ چند آدمی معظم علی کے اشارے پر ڈیڑھی کے اندر داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں گھوڑے بدرجاس ہو کر کھلبلی چارپے تھے۔ چھپرے نیچے لیٹے ہوئے تین آدمی کچے بھڑکے بڑبڑا کر اٹھے۔ لیکن معظم علی کے ساتھیوں نے انہیں بندوقوں کے کندوں سے مار مار کر ڈھیر کر دیا۔ ایک پہریلے نے چیخنے کی کوشش کی لیکن کسی نے اس کا گلا دبا دیا۔ ڈیڑھی کے اندر اور چھپرے کے نیچے باقی پہریلے انتہائی پریشانی اور خوف کی حالت میں ان غیر متوقع حملوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

معظم علی نے کہا یہ گاؤں ہمارے محاصرہ میں ہے۔ تھارے لیے اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اگر کسی نے شہر چلانے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ تھاری بستی ابی میں ہے کرتھ باچون دچا ہمارے حکم کی تعمیل کرو!

تھوڑی دیر بعد معظم علی کے ساتھی پہریلوں کو ہانک کر غلے کے ایک گودام میں بند رکھتے تھے۔ معظم علی گودام کا دروازہ بند کر رہا تھا کہ اکر خاں بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا: بھائی جان! حویلی کے چھانک میں قتل لگا ہوا ہے، آپ ان سے چابی لے لیں۔

چابی کس کے پاس ہے؟ معظم علی نے پہریلوں سے سوال کیا۔

جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو معظم علی نے دوبارہ کہا: میں حویلی کی چابی لاگتا ہوں۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر چابی ہمارے حوالہ نہ کی گئی تو اس گودام کو آگ لگا دی جائے گی۔

ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے کچھ کہے بغیر ایک چابی معظم علی کے ہاتھ میں دے دی۔ معظم علی دروازے کی کڑی لگنے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ دو آدمی پہلے دروازے کے پاس کھڑے رہیں اگر یہ لوگ شور مچائیں تو اس حویلی کو آگ لگا دی جائے اور باقی فوراً گھوڑوں پر سوار ہو جائیں!

حویلی کے صحن میں تین طرف دیواروں کے ساتھ چھپوں کے نیچے کوئی ڈیڑھ سو گھوڑے

کے ساتھ کوٹلی کا دروازہ بند کیا اور گڑیوں کے سہارے چھت پر چڑھ گیا۔

اس چھت سے آگے دوسری حویلی کے مکانات کی چھتیں قریباً ایک گز نیچی تھیں۔ معظم علی اپنے ساتھیوں کو دیہی رکنے کا حکم دے کر سلاہا بادش میں گھنٹوں کے بل ریگتا ہوا آگے بڑھا۔ دوسری چھت کی مٹڈر کے قریب پہنچ کر اس نے حویلی کے صحن کا جائزہ لیا۔ اس حویلی کا بیشتر حصہ تاریک تھا۔ دائیں ہاتھ کی دیوار کے درمیان ایک کشادہ ڈیڑھی میں ایک مشعل جل رہی تھی جس کی روشنی میں ڈیڑھی سے آگے ایک چھپرے کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ چھپرے کے نیچے چند آدمی کھائوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ معظم علی نے دبی زبان میں اپنے ساتھیوں کو کڑی اور دہانے کے بڑے کر ایک لمبی قطار میں منڈر کے پچھے لیٹ گئے۔ معظم علی نے پہلے اکر خاں کو نیچے لٹا دیا پھر خود منڈر کے ساتھ نلک کر اڑ گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کے تمام ساتھی کسی وقت کے بغیر دوسری حویلی کے صحن میں پہنچ گئے۔ معظم علی نے باقی آدمیوں کو دیہی صحن کے کاحکم دیا اور اکر خاں کے علاوہ تین اور ساتھیوں کے ہمراہ پانی اور کچھ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے روشن حصے کی طرف بڑھا۔ چھپرے کے نیچے دو چلپائیوں کے درمیان خلی جگہ میں سے گزر کر یہ لوگ ڈیڑھی کے اندر داخل ہوئے۔ ڈیڑھی کے اندر دو آدمی کھائوں پر اور سات آدمی فرش پر سو رہے تھے۔ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ ایک مشعل جل رہی تھی۔ اور اس کے قریب ہی تیل کی گتھی پڑی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ ایک کھاٹ کے سرانے دیوار کے ساتھ چند بندوتیں اور بارود کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو ان پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ فرش پر لیٹے ہوئے آدمیوں سے پاؤں پکارتے ہوئے آگے بڑھے اور بندوتیں اٹھا کر دے پاؤں بائیں لائے۔

معظم علی نے مشعل اٹھائی اور اس پر کچھ سے تیل ڈالنے کے بعد واپس مڑا۔ ڈیڑھی سے چھپرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے دائیں بائیں چھ آدمی چارپائیوں پر سو رہے ہیں اور ان چارپائیوں سے آگے دونوں طرف چھپرے کے نیچے گھوڑوں کی کھڑکیاں ہیں۔ معظم علی نے مشعل بلند کر کے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا اور ان کی آن میں اس کے ساتھی آگے بڑھ کر ڈیڑھی

پھر وہ بھاگتا ہوا حویلی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے اسے مشعل کی روشنی میں چوکی کا محافظ دکھائی دیا۔

”کیا ہوا جناب؟“ اس نے ہانپتے ہوئے سوال کیا۔ گھوڑے خود بخود کیسے نکل گئے؟ گھوڑے ڈاکو لے گئے ہیں؟“

”لیکن سپریدار کہاں گئے تھے؟“

”سپریداروں کو ہم نے ایک کوٹھڑی سے نکالا ہے۔ تم اپنے قیدیوں کا خیال رکھو!“

”جناب قیدیوں کی آپ غور کریں۔ لیکن اتنے گھوڑوں کا نقصان؟“

مرلی دت کا ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے دو سپاہیوں کے گم ہو جانے کی اطلاع دی۔

مرلی دت نے سوال کیا۔ ”تم نے قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھی ہیں؟“

”ہاں جناب! وہ تو بند ہیں اور ان میں تلے لگے ہوئے ہیں۔“

ایک دوسرا سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی۔ ”جناب قیدی اندر سے کوئی آواز نہیں دیتے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پیچھے کی دیوار میں لقب لگا کر دوسری حویلی میں نہ پھلے گئے ہوں۔“

مرلی دت نے برہم ہو کر کہا: ”قیدی ناخنوں سے ڈیڑھ گز چوڑی دیوار نہیں کھود سکتے

وہ صرف ہماری پریشانی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔“

چوکی کے محافظ نے کہا: ”میں قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد مرلی دت مشعل کی روشنی میں اپنا صندوق خالی دیکھنے کے بعد چلا چلا کر اکبر خاں کو آوازیں دے رہا تھا اور چوکی کا محافظ چند افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ اس کے سر پر کھڑا تھا۔

ایک اور سپریدار بھاگتا ہوا چھوٹا لاری میں داخل ہوا اور اس نے چلا کر کہا: ”سرکار غضب

بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کی کھریوں کے اوپر دیوار میں لگی ہوئی کھونٹیوں کے ساتھ گھوڑوں کی رگائیں اور زینیں ٹنکی ہوئی تھیں۔ اپنی ضرورت کے مطابق گھوڑے تیار کرنے کے بعد نظم کے ساتھیوں نے باقی تمام گھوڑے کھول کر ڈیوڑھی کے سامنے جمع کیے پھر حویلی کا پھاٹک کھل دیا گیا اور وہ گھوڑوں کا ریوڑ اٹکتے ہوئے باہر نکل آئے۔

گھوڑوں کی ٹاپ سن کر گاؤں کے سپریدار بھاگے ہوئے اس تنگ گلی میں داخل ہوئے لیکن وہ گھوڑوں کے سموں تلے پس کمرہ گئے۔

چند منٹ بعد جب ساتھ دالی حویلی کے محافظ بند و تین چلا کر اور فقار سے سبکدوشوں کو خبردار کر رہے تھے۔ معظم علی اور اس کے ساتھی گاؤں سے باہر سرسبز فوج کا پڑاؤ عبور کر رہے تھے اور پھر جب پڑاؤ کے سپاہی اپنے خیموں سے باہر نکل کر انتہائی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ لوگ دو تین میل آگے جا چکے تھے۔

مرلی دت حویلی میں شور سن کر گہری نیند سے بیدار ہوا اور لیٹے لیٹے اپنے سپاہیوں کو آوازیں دینے لگا۔ سپاہی بھاگ کر اس کی چھو لاری میں داخل ہوئے تو اس نے پوچھا: ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں جناب!“ ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ”ساتھ دالی حویلی سے گھوڑے کھل کر باہر نکل گئے ہیں۔“

”گھوڑے باہر کیسے نکل گئے؟“ اس نے برہم ہو کر سوال کیا۔

”پتا نہیں کیسے نکل گئے جناب! حویلی کا دروازہ کھلا ہے اور سپریدار کہیں غائب ہیں“ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھوڑوں کو روکنے کے لیے ان کے پیچھے گئے ہیں۔“

”کتے گھوڑے بھاگ گئے ہیں؟“

”جناب تمام نکل گئے ہیں وہاں ایک بھی نہیں رہا۔“

مرلی دت بستر سے اٹھا اور سپاہیوں کو دھکے دیتا ہوا باہر نکل کر بولا: ”تم پاگل ہو رہا ہوں گھوڑے خود بخود کیسے بھاگ سکتے ہیں۔“

اسے فوراً حاضر کر دیا۔

داروغہ سلام کر کے باہر نکل گیا۔ اعلیٰ دردی خاں کی نگاہیں دوبارہ مراسلے پر مرکوز ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی کمرے میں داخل ہوا۔ اعلیٰ دردی خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ گزری سے مصافحہ کیا اور مراج الدولہ نے اس کی تقلید کی۔ اعلیٰ دردی خاں نے کہا: "ہم تمہارے متعلق مایوس ہو چکے تھے۔ بیٹھو، اور مجھے اپنی سرگزشت سناؤ۔"

معظم علی، اعلیٰ دردی خاں کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور اس نے مختصر اپنی سرگزشت بیان کر دی۔

اختتام پر اعلیٰ دردی خاں نے کہا: "کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ تم میرے صیب کی قید میں ہو۔ تمہاری گرفتاری یقیناً عطاء اللہ خاں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے ہم اسے ملک چھوڑ چکے ہیں۔"

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا: "مجھے یقین ہے کہ میری گرفتاری تمہارا عطاء اللہ خاں کی سازش کا نتیجہ نہ تھی اس کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے۔"

اعلیٰ دردی خاں نے جواب دیا: "سازش درحقیقت ہمارے خلاف تھی اور عطاء اللہ خاں کے جن ساتھیوں پر ہمیں شبہ تھا وہ سب فوج سے نکلے جا چکے ہیں۔ میرے صبر نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کے دل میں عطاء اللہ خاں کے متعلق کچھ شکوک پیدا ہو گئے تھے اور انھوں نے تمہیں فوج کی حفاظت کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا تھا۔"

"عالیجاہ! انھوں نے مجھے منع مزور کیا تھا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ابتداء سے ہی عطاء اللہ خاں کے رازدار نہیں تھے۔"

اعلیٰ دردی خاں نے قدرے آزدہ ہو کر جواب دیا: "اگر وہ عطاء اللہ خاں کے رازدار بن کر ہمیں بردقت اس کے ارادوں سے باخبر نہ کرتے تو اڑلیہ میں ہمیں انتہائی خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ بہر حال اگر تم یہ جانتے ہو کہ تمہاری گرفتاری کے صحیح اسباب معلوم

ہو گیا۔ معظم علی کی کوٹھری خالی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خالی ہے؟ اس نے سراپہ ہو کر سوال کیا۔"

"جناب میں نے ٹوٹ کر دیکھا تو اس کا آٹا غائب تھا۔ صرف کنڈی باہر سے بندھتی میں دروازہ کھول کر اندر گیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔"

مرلی دت نے سراپا فریاد بن کر چوکی کے محافظ کی طرف دیکھا اور کہا: "سرکار چاہیوں کا کچھ غائب ہے۔"

چوکی کے محافظ نے کچھ کھسے بغیر مرلی دت کے بستر سے اس کی بانسری اٹھائی اور اسے بے تماشاً پیشینا شروع کر دیا۔

اعلیٰ دردی خاں، میدان پور کے سرکاری محل میں مقیم تھا اور اس کی فوج شہر سے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ ایک صبح وہ محل کے کشادہ کمرے میں بیٹھا اپنے میرمنشی کو درخواستوں اور مراسلوں کے جواب لکھوا رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ ایک کرسی پر مراج الدولہ بیٹھا ہوا تھا۔ محل کا داروغہ اندر داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد آگے بڑھ کر ایک مراسلہ پیش کیا۔

اعلیٰ دردی خاں، میرمنشی کو چند جملے لکھوانے کے بعد داروغہ کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا: "عالیجاہ! یہ معظم علی کی درخواست ہے اور وہ اسی وقت قدوسی کی اجازت چاہتا ہے۔"

"معظم علی کون ہے؟" اعلیٰ دردی خاں نے مراسلہ کھولتے ہوئے سوال کیا۔

داروغہ نے جواب دیا: "عالیجاہ! یہ وہی نوجوان ہے جسے صہنور نے سرحدی ملاؤں کا محافظ مقرر کیا تھا وہ مدت سے لاپتہ تھا اور اب مرہٹوں کی قید سے فرار ہو کر یہاں پہنچا ہے۔"

اعلیٰ دردی خاں نے جلدی سے مراسلہ کھول کر پڑھا اور داروغہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا

کے لیے ایک ٹرپ موس کرتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے آپ کا پرچم بلند رکھنے کے لیے پیش کیا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ آپ کے دشمنوں کو جنگل کا دشمن اور جنگل کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اب اگر آپ نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے تو ایسے لوگوں کو اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا جو اپنے خون کی روشنائی سے قوم کی آزادی کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں۔

علی دردی خاں نے کہا: "کاش قوم میں تمہارے جیسے چند اور نوجوان ہوتے۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تمہیں ہماری مجبوریوں کا علم نہیں۔ میں بیک وقت ان ان گنت طالع آزمائوں کے ساتھ کیسے ٹٹ سکتا ہوں جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حکومت کی منہ کا دھندہ سمجھتا ہے۔ موجودہ حالات میں میرے صیب کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھانا میرے لیے ایک مجبوری ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "آپ اس لیے مجبور ہیں کہ آپ حکومت کا کاروبار چلانے یا ہنگامی حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند طالع آزمائوں کے درمیان توازن قائم رکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں ان جاہ پسندوں میں سے کسی کو بھی قوم کی عزت اور آزادی کا امین نہیں سمجھتا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ قوم کی اجتماعی قوت مصلحت ہی ہماری بقا اور آزادی کی ضمانت ہے۔ سکتی ہے۔ یہ ابن الوقت، یہ غدار اور یہ اقتدار کی مسندوں کے لیے بے حیا دعویدار، عوام کی بے بسی، بددلی اور مایوسی کی پیلاوار ہیں اور میں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ سودا کرنے کی بجائے آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان کے خلاف قوم کی قوت محاسبہ بیدار کریں۔ یہ وہ ناسور ہیں۔ جنہیں ٹاکٹ کر جڑ سے نکلے بغیر ایک صحت مند قوم کی تحقیق ممکن نہیں۔ اور جو حکومت ایک صحت مند قوم کی تحقیق سے قاصر رہتی ہے اس کے لیے گھر کے غدار برہمنی حملہ آوروں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں؟"

علی دردی خاں نے قدسے تلخ ہو کر کہا: "نوجوان تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ میرے صیب کے خلاف تمہارے غم و فخر کی وجہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں لیکن موجودہ حالات میں

یکے جائیں تو یہ مشکل نہیں۔ ہم میرے صیب سے تمام باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔ میرے صیب نے ہمارے ساتھ صلح کی درخواست کی ہے اور ہم صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے میرے جھڑکی سرکردگی میں ایک وفد اس کے پاس بھیج رہے ہیں۔"

معظم علی نے بدحواس ہو کر سوال کیا: "آپ میرے صیب سے صلح کرنا چاہتے ہیں؟" ہاں! ہم اٹلیس پر ہٹوں کے پلے درپلے حلوں سے تنگ آچکے ہیں۔ میرے صیب بعض شرائط پر اٹلیس کی حفاظت کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہے اس کے لٹمی دوبار ہمارے پاس آچکے ہیں۔ میرے جھڑکی خیال ہے کہ وہ ہماری ملازمت اختیار کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔ اگر میرے جھڑکی اسے رام کر لیا تو ہم اسے بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔ مریٹوں کے ساتھ پنشن کے لیے اس سے بہتر آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم نہایت وقت پر آتے ہو اور میری خواہش ہے کہ اس کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے تمہیں بھی میرے جھڑکی کے ہمراہ بھیج دیا جائے۔"

معظم علی کچھ دیر حیرت و استعجاب کے عالم میں علی دردی خاں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کلمہ عالجیہ: "اگر یہ گستاخی نہ ہو تو میں کچھ عرض کروں!"

"میرے صیب جیسے لوگوں سے ہم کلام ہونے کے لیے ہمیں تواریک زبان کی ضرورت ہے۔ میں پھر یوں سے بھڑیوں کی حفاظت کا کام لینے کی منطق کا قائل نہیں۔ میں میرے صیب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک غدار ہے اور ایک غدار پر دوبارہ اعتماد کرنا بڑے درجے کی خود دہی ہوگی۔ اگر وہ صرف آپ کا دشمن ہوتا تو آپ اس کا ہتھی فزائوش کرنے میں حق بجانب ہوتے۔ لیکن وہ آپ کی حکومت سے زیادہ جنگل کے باشندوں کی عزت و آزادی اور بھلا کا دشمن ہے اور جنگل کا کوئی محب وطن اس کا ماضی فزائوش کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔"

میں آپ کی فوج میں اس لیے شامل ہوا تھا کہ میں اپنے دل میں جنگل کی عزت اور آزادی

ہیں اس کی دشمنی کی بجائے اس کی دوستی کی ضرورت ہے۔
معظم علی نے جواب دیا: میرے صیب کی دوستی حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایک معمولی سپاہی کی ضرورت نہیں۔ اگر موجودہ حالات مجھے ایک حقیقت پسند انسان بننے سے منع کرتے ہیں تو میرے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اپنی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں اور اس وقت کا انتظار کروں جب ہماری قسمت کے امین درست اور دشمن میں تیز کر سکیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔
معظم علی یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

علی دردی خاں چند ثانیے غصے — اور غصے سے زیادہ پریشانی اور اضطراب کی حالت میں معظم علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: معظم علی! میں اپنی توارک کو ہا سپہ سالار ہوں تمہارا استعفا منظور نہیں کیا جائے گا۔ ایک طویل عرصہ مرہٹوں کی قید میں رہنے کے بعد تم چھ ماہ کی رخصت کے حق دار ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم اس عرصہ میں یہ سمجھ سکو گے کہ میرا یہ اقدام صحیح تھا۔ مرہٹوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے میرے صیب کو قابو میں لانا ضروری ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔

معظم علی باہر نکل گیا اور علی دردی خاں سراج الدولہ کی طرف دیکھنے لگا۔
سراج الدولہ نے کہا: جہاں پناہ اگتا رہے ہوئے کے باوجود وہ ایک اچھا سپاہی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ چھ ماہ کے بعد بھی شاید ہماری فوج میں دوبارہ آنا پسند کرے۔
علی دردی خاں مسکرایا: ”وہ خود علی کا بیٹا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی اگر ہمیں کسی محاذ پر جانا پڑے تو وہ گھر جانے کی بجائے ہماری اگلی صف میں لڑنا پسند کرے گا۔ تم جادو اور اسے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کرو۔ کسی دن وہ تمہارے ترکش کا بہترین تیرنابت ہو گا۔“

سراج الدولہ نے کہا: تو آپ اس سے خفا نہیں ہوئے؟

علی دردی خاں نے معنوم بے میں کہا: ”خفا؟ ایک بوڑھا اپنی لاشی سے ایک سپاہی اپنی تلوار سے، ایک مصنف اپنے قلم سے اور ایک فرزند اپنے عصاب سے حکمرانی سے کیونکر خفا ہو سکتا ہے۔ ہاں مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ جب وہ انتہائی اشتعال کی حالت میں بول رہا تھا تو میں نے اُسے ٹھہر کر بیٹھنے سے کہا نہ لگایا۔ کاش! میرے ہونٹانے میں اس قسم کی تلواں اور سب تو ہیں اور میں ہر محاذ پر ہر دشمن کو کھڑکھڑاتا۔ لیکن جب تمہارا وقت آئے گا تو مجھے یقین ہے کہ جنگال کے حالات اس سے منت ہوں گے۔ معظم علی یہ فوجیوں کے دل کی دھڑکنوں میں ایک نئی قوم جنم لے گی۔ تم جادو ادب کی سیسے سے کہو کہ اسے اس کے ساتھیوں کو قید کے زلزلے کی پوری تھوڑا ادا کر دی جائے۔ ہم ایک ہفتہ تک قید رہیں گے اور وہاں میں یہ کوشش کروں گا کہ اسے تمہاری محافظ فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا جائے۔“

سراج الدولہ کمرے سے نکلا اور علی کے دروازے پر معظم علی سے جا ملا اور اس نے اسے آواز دے کر روکے ہوئے کہا: مجھے آپ سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔
”فرمائیے! معظم علی نے کہا۔“

سراج الدولہ نے کہا: میں یہاں سے سیٹھا بھلی جا رہا ہوں اور شاید کچھ عرصہ مرشد آباد رہا سکوں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ مستعفی ہونے کے متعلق اپنا اعلان تبدیل کر سکیں تو میرے پاس آئیں مجھے وہاں اپنی فوج کے لیے قابل اعتماد افسروں کی ضرورت ہے۔ آپ مجھے قابل اعتماد سمجھتے ہیں؟ معظم علی نے مسکرا کر سوال کیا۔

سراج الدولہ نے جواب دیا: اگر میں آپ کو قابل اعتماد نہ سمجھتا تو دودھ نہ پاتا ہوتا آپ کے پیچھے نہ آتا۔ چلیے ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

معظم علی اس کے ساتھ علی کے ایک کمرے میں داخل ہوا اور وہ قریباً دو گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت سراج الدولہ نے اس کے ساتھ گرجی سے مصافحہ کرتے

آٹھواں باب

آمنہ بالا خانے کے ایک کمرے میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پڑھ رہی تھی کہ صابہ بھاگتا ہوا زمانہ مکان کے صحن میں داخل ہوا اور پوری طاقت کے ساتھ چلانے لگا۔ "معظم علی آگیا!"

آمنہ قرآن بند کر کے اٹھی، لیکن اس میں بولنے یا چلنے کی ہمت نہ تھی۔ نیچے خادمہ صابہ کا بازو پکڑ کر جھجھوڑ رہی تھی۔ کہاں ہے معظم علی؟ خدا کے لیے بتاؤ کماں ہے؟ لیکن وہ اس کی طرف توجہ دیتے بغیر بالا خانے کی طرف منہ اٹھا کر بدستور چلا رہا تھا۔ بی بی جی! بی بی جی!! معظم علی آگیا۔ معظم علی آگیا!"

معظم علی، اکبر خاں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا اور خادمہ بھاگ کر بالا خانے کی میسرین پر چڑھنے لگی۔ بی بی جی! معظم علی... اس نے پوری قوت سے چلانے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں بیٹھ گئی۔

آمنہ لڑکھاتی ہوئی دریچے کی طرف بڑھی۔ معظم علی نے اس کی طرف دیکھا، اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ چند ثانیے بعد وہ اپنی ماں کے سامنے کھڑا تھا اور وہ ایک سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ای جان میں آگیا ہوں؟" معظم علی نے بھرائی ہوئی آوازیں کہا۔ اور ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔

دئے کہا: کیا میں یہ توقع رکھوں کہ چند دنوں یا چند ہفتوں کے بعد آپ میرے پاس پہنچ جائیں گے؟ معظم علی نے جواب دیا: "میں آپ سے صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ اگر مستفی ہونے کے متعلق میں نے اپنا ارادہ تبدیل کیا تو کسی اور کے پاس جانے کی بجائے میں سیدھا آپ کے پاس آؤں گا۔"

سراج الدولہ نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ آپ کا ارادہ بہت جلد بدل جائے گا۔" تھوڑی دیر بعد معظم علی بارہ سواروں کے ہمراہ مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا۔ اور ان میں سے آٹھ وہ تھے جو معظم علی کے ساتھ قید ہوئے تھے۔ باقی راستے کی مختلف منازل پر اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

میدان پور چند گھنٹے قیام کے دوران میں معظم علی اپنے اور مرزا حسین بیگ کے گھر کی خیریت معلوم کر چکا تھا۔ اس کے محلے کا ایک سپاہی اسے یہ بتا چکا تھا کہ اس کا باپ مرشد آباد میں ہے۔ اس کا بھائی یوسف اس کے ردپوش ہونے کے بعد عظیم آباد سے مرشد آباد آگیا تھا اور اب میرمدن نے ڈھاکہ کی فوجداری سنبھالنے کے بعد اسے اپنے پاس بلا لیا ہے۔ ہنسل بیگ مرشد آباد میں ہے۔

مرشد آباد سے میرمدن کی تبدیلی کی خبر اس کے لیے پریشان کن تھی۔ لیکن فوج کے ایک افسر سے تبادلہ خیالات کے بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ میرمدن نے مرشد آباد کے بعض اہل بالخصوص میرجعفر سے شدید اختلافات کے باعث، علی وردی خاں سے یہ درخواست کی تھی کہ اسے ڈھاکہ بھیج دیا جائے۔

تھوڑی دیر بعد وہ بالا خانے کے اسی کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مسکراہٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی، ماں اور باپ کے اُن گنت سولات کے جواب میں اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔

صابر نے سیزھویوں سے آواز دی: "مرزا حسین بیگ آئے ہیں۔"

انہیں اوپر لے آؤ۔ محمود علی نے کہا۔

ان کے ساتھ آواز دی بھی ہیں: "صابر نے جواب دیا۔"

اچھا انہیں دلو! سنا نے میں بٹھاؤ، ہم آتے ہیں۔"

جب معظم علی اور اس کا باپ بچے اترنے لگے تو اکبر خاں ان کے پیچھے ہولیا۔

آمنہ نے کہا: "تم کہاں جاؤ گے بیٹا! تم یہیں بیٹھو۔ میں تم سے تمام واقعات سننا چاہتی ہوں۔"

مرزا حسین بیگ اور محنت کے دوسرے لوگوں سے ملاقات کرنے کے بعد معظم علی واپس آیا تو اکبر خاں قائلین پر پڑا کمری غنید سو رہا تھا۔ خادمہ ناشائے کرائی تو معظم علی، اکبر خاں کو جھگڑنے لگا۔ لیکن ماں نے کہا: "بیٹا اسے نہ جگاؤ۔ میں اسے ناشائے کھلا چکی ہوں۔"

محمود علی نے جلدی سے ناشائے کر کے اٹھتے ہوئے کہا: "معظم! مجھے آج دفتر میں چند ضروری کام ہیں۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ اتنی دیر تم اپنی ماں سے باتیں کر دو۔ میں بہت کراہی پیغام بھیجتا ہوں کہ وہ بھی ایک دو دن کی چھٹی لے کر گھر آجائے۔"

محمود علی کے جانے کے بعد معظم دیر تک اپنی ماں کے مختلف سولات کے جواب دیتا رہا۔ بالآخر اس نے پوچھا: "امی جان! فرحت اور اس کی امی کیسی ہیں؟"

"وہ بہت خوش ہیں بیٹا۔" ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

"کیا ہوا امی جان؟" معظم علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"میرا لال۔ میرا بیٹا! اس نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔"

معظم علی بے اختیار ماں کے ساتھ لپٹ گیا۔ آمنہ اب بڑی شکل سے اپنی چیمیں

ضبط کر رہی تھی۔

میرے چاند۔ میرے لال! مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے۔ میں ہر روز تمہیں خواب

میں دیکھا کرتی تھی۔

"اباجان کہاں ہیں؟" معظم علی نے سوال کیا۔

وہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے۔ یہ کہہ کر آمنہ خادمہ کی طرف

متوجہ ہوئی جو دروازے میں کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ "تم جلدی سے ناشائے تیار کرو اور

صابر سے کھانا کے اباجان کو اطلاع دے دے۔"

صابر جا چکا ہے۔ خادمہ یہ کہہ کر نیچے چلی گئی۔

ماں اور بیٹا قائلین پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ماں نے اس کے سر پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "تم کہاں تھے بیٹا؟"

امی جان میں مرہٹوں کی قید میں تھا۔ معظم علی یہ کہہ کر اٹھا اور درپے کے قریب جا کر

وکر دی: "اکبر خاں! تم نیچے کیوں کھڑے ہو اور آجاؤ؟"

اکبر خاں کون ہے؟ ماں نے سوال کیا۔

معظم علی نے مسکرا کر جواب دیا: "امی جان آپ کے لیے ایک اور بیٹا لایا ہوں۔ وہ میرے

ساتھ قید تھا اور میں اسی کی وجہ سے رہا ہوا ہوں۔"

اکبر خاں جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس نے معظم علی کی ماں کو سلام کیا۔

آمنہ نے جواب دیا: "بھتے رہو بیٹا۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔"

کوئی دس منٹ بعد نیچے صحن سے محمود علی کی آواز آئی: "کہاں ہے معظم علی؟"

معظم علی اتر کر بیٹا گیا جو نیچے اترا اور بے اختیار اپنے باپ کے ساتھ لپٹ گیا۔

کچھ نہیں بیٹا! ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم مرزا صاحب سے مل آئے ہونا؟"

ہاں امی جان! لیکن افضل مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ مرزا صاحب کہتے تھے وہ کل شکار پر چلا گیا ہے، میرا خیال ہے میں جی جان کو سلام کر آؤں۔
ہاں بیٹا ضرور جاؤ۔

معظم علی نے پوچھا۔ امی جان فرحت کی امی آپ سے ملا کرتی ہیں نا؟
ہاں بیٹا! کبھی میں ان کے یہاں چلی جاتی ہوں اور کبھی وہ ہمارے یہاں آجلیا کرتی ہیں۔ پہلے فرحت بھی ان کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ لیکن اب کچھ عرصے سے وہ گھر سے نہیں نکلتی۔
امی جان! کیا بات ہے، آپ مغموم کیوں ہو گئیں؟

کچھ نہیں بیٹا! ماں نے آئندہ ہو کر کہا۔ "کاش تم دو بیٹے پہلے آجاتے۔"

اور معظم علی انتہائی اضطراب کی حالت میں ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

ماں نے قدرے وقف کے بعد کہا۔ "بیٹا! فرحت کی منگنی ہو چکی ہے۔"

ایک ٹائپ کے لیے معظم علی نے عروس کیا کہ کائنات کے نظام میں یکایک ٹھکانے آ گئے اور زمانے کی ایک ٹھکانے سے امیدوں، آنندوں، امنگوں اور دلوں کے حسین اور سردا بہار نخلتوں سے نکال کر ایک بے آب و گیاہ صحرا کی بیسیا تک دستوں میں پھینک دیا ہے۔

فرحت کی منگنی ہو چکی ہے۔ یہ چند الفاظ معظم کے لیے حال اور مستقبل کی اس دستان کا عنوان تھے جو لغتوں، مسکراہٹوں اور قہقروں سے غالی تھی۔ وہ رنگین پسٹوں، دلفریب نظاروں اور دکش نقوش کی حسین وادیوں سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ جس کی صحن سوج کی حصار پاشیوں سے اور جس کی راہیں ساروں کی مسکراہٹوں اور چاند کے قہقروں سے مغموم تھیں۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن ماں کے لیے یہ مسکراہٹ بڑا دل آسنوں سے زیادہ دردناک تھی۔ معظم علی نے سنبھل کر کہا۔ امی جان آپ فرحت کی منگنی پر خوش نہیں ہیں؟
اور ماں نے جواب دینے کی بجائے اسے کیچنگ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"بیٹا! اس نے اس کے چہرے پر ہلارے لہجہ پھیرتے ہوئے کہا۔ مرزا حسین بیگ کو تمہارا بہت خیال تھا۔ لڑکے والے کئی بادان کے یہاں آئے۔ لیکن وہ ہر بار انکار کرتے رہے۔ پھر جب وہ تمہارے متعلق پوچس ہو گئے تو افضل نے ہاں کر دی۔ اس بات کو ایک ہفتہ پہلے سے میں منگنی کے دن ان کے ہاں گئی تھی۔ شہر کے امار کی بویاں دال جمع تھیں۔ میں نے جب فرحت کی ماں کو مبارک باد دی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے کہا: بہن خدا کو منگند نہ تھا۔ درنہ مرزا صاحب یہ فیصلہ کر چکے تھے، کہ فرحت آپ کی ہے۔ اب آپ میری بیٹی کے لیے دعا کریں۔" اس کے بعد جب میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میں یہ عروس کر رہی تھی کہ فرحت میری بیٹی ہے اور وہ نوجوان جس کے ساتھ اس کی منگنی ہو رہی ہے، صرف عابد کا ہی نہیں بلکہ میرا بھی داماد ہے۔"

جس وقت ماں بیٹے آپس میں یہ باتیں کر رہے تھے۔ فرحت اپنے مکان کے ایک کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک بے تکلف ہسلی جس کا نام ناصر تھا، کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے دبے پاؤں فرحت کے پیچھے جا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔ "بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟"

"چھوڑو ناصر مجھے تنگ نہ کرو۔" فرحت نے مغموم آواز میں جواب دیا۔

"غلط! بالکل غلط!!" ناصر نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں ناصر نہیں ہوں میں معظم علی ہوں۔ سستی ہو میرا نام معظم علی ہے۔"

"نامو خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔" اس نے انتہائی مغموم لہجے میں کہا۔

ناصر قدرے نادام سی ہو کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ فرحت کی آنکھیں آنسوؤں سے لبرزد تھیں۔

بعد وہ اودھ کی سرحد سے دس میل دور روہیکھنڈ کے چرواہوں اور کسانوں کی چند بستیوں عبور کرنے کے بعد ایک ٹیلے پر گھوڑے روک کر اپنے سامنے ایک سرسبز و شاداب اادی دیکھ رہے تھے کہ برہان نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ میرا گاؤں ہے!"

پھر وہ ٹیلے سے اتر کر کچھ دیر ایک گھنے جنگل سے گزرنے کے بعد گندم کے مسماتے جوئے کھیتوں میں داخل ہوئے اور ابرہان نے کہا: "یہ ہماری زمین ہے!"

مقنوی دیر بعد وہ گاؤں میں داخل ہوئے اور ان کی آن میں گاؤں کی خاموش گلیاں ابرہان لگیا۔ ابرہان انہیں ان کے گھروں سے گونجے بچے، بڑھے اور جوان ان کے گرجے ہوئے وہ گھوڑوں سے اتر پڑے گاؤں باہر شخص ابرہان کو دیکھنے اس سے بھٹکے ہوئے اور اس سے باتیں کرنے کے لیے بیقرار تھا: "مقنوی دیر بعد یہ جویم ایک قلعہ نما مکان کے سامنے رکا اور ابرہان نے معظم علی سے کہا: "بھائی بھان! یہ ہمارا گھر ہے۔"

ایک خوش وضع نوجوان دروازے سے نودار ہوا اور لوگوں کو ابھر اُدھر بٹاتے ہوئے آگے بڑھ کر ابرہان سے پیٹ گیا۔ یہ ابرہان کا بڑا بھائی اطرہاں تھا۔

چند دن بعد معظم علی اس علاقے کے کسی آدمی کے لیے اجنبی نہ تھا۔ ابرہان کے قبیلے کا بچہ بڑھا اسے اپنا محسن خیال کرتا تھا۔ اطرہاں جو اپنے باپ کی موت کے بعد قبیلے کا سردار تھا، معظم علی کا بے تکلف دوست بن گیا تھا۔

یہ گاؤں اور اس کے ارد گرد دس اور بستاں، بگشت افغانوں کے لوگوں سے آباد تھیں اور وہ سب ابرہان کے خاندان کی سرداری تسلیم کرتے تھے۔ روہیکھنڈ کے دوسرے افغانوں کی طرح یہ لوگ اچھے کاشت کار اور چرواہے ہونے کے علاوہ بہترین سپاہی و صلاحتیں کے مالک تھے۔ بیرونی حملہ آوروں بالخصوص مرہٹوں کی بوٹ مارے بچنے کے لیے ہر روز ہیلو نواز بازی، تیغ زنی اور شہسواری میں کمال حاصل کرنا اپنا فرض خیال کرتا تھا جب ہندوستان کے باقی علاقوں کو بے حیا سیاسی شاطران اور عین قسمت آزمائوں نے کبکٹ و انڈاس کے

کر اس نے کہا: "فحش تھیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ابا جان اب اپنا عیال بدل دیں گے۔"

"ناہ وہ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کہو۔ میں ابا جان کو سارے ملک میں رسوا کرنے کی بجائے اس مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دینا آسان سمجھتی ہوں۔"

"لیکن معظم علی آگیا ہے۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔"

فحش نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا: "معلم علی آگیا ہے لیکن فحش اس کے لیے مری ہے۔ فحش اس دن مر گئی تھی جس دن اس نے مٹی کا جوڑا پہنا تھا اور اب میرے والدین مجھے معظم علی کے لیے قبر سے نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے!"

معلم علی کے دل میں تہائی اور بے کسی کا احساس بڑھتا گیا۔ گھر سے باہر مرشد آباد کی گلیاں اسے اداس نظر آتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ حسین بیگ کے پاس جاتا۔ حسین بیگ اس کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آتا۔ اس کے ساتھ افضل کا برتاؤ بھی نہایت دوستانہ تھا۔ لیکن معظم علی ہر ملاقات کے بعد اپنے دل پر ایک بوجھ محسوس کرتا ہوا گھر واپس آتا۔ پانچ دن بعد یوسف علی آیا اور دو دن گھر رہ کر واپس چلا گیا۔

قید سے واپس آئے سے بعد اس نے ابرہان سے وعدہ کیا تھا کہ مرشد آباد پہنچتے ہی میں تمہیں روہیکھنڈ پہنچانے کا انتظام کر دوں گا۔ اور ابرہان نے جب دس دن اس کے گھر ٹھہرنے کے بعد اپنے وطن جانے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا: "ابراہان تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے میں خود تمہارے ساتھ جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

ابرہان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے کہا: "بھائی جان! اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو میں چند بجتے اور یہاں ٹھہر سکتا ہوں۔"

چوتھے روز علی اصباح معظم علی، ابرہان کے ساتھ روانہ ہوا۔ چند دن سفر کرنے کے

کے رخصت کے دن ختم ہونے کے قریب آرہے تھے تو اس نے چند بار استغفار لکھنے کا ارادہ کیا لیکن جب وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھتا تو اس کی قوت فیصلہ جواب دے جاتی۔

ایک دن اسے معلوم ہوا کہ سراج الدولہ مرشد آباد آیا ہوا ہے۔ وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سراج الدولہ نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا: کیسے اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟

معظم علی نے جواب دیا: "میں چند دنوں سے ہنگی پہنچنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ سراج الدولہ نے کہا: "میری درخواست ہے کہ ہنگی کے قلعے کی کمان آپ کے سپرد کر دی جائے۔

میں ایک ہفتہ تک واپس جا رہا ہوں۔ اس لیے آپ تیار رہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا اگر ہنگی کے قلعے کے لیے آپ میری ضرورت محسوس کرتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ انتظار کرنے کی بجائے کل ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔

بہت اچھا! شام تک آپ کے پاس میرا حکم نامہ پہنچ جائے گا۔"

اگلے دن علی الصباح معظم علی ہنگی کا رخ کر رہا تھا اور چند دن بعد ہنگی کے قلعے کے آرام طلب سپاہی اور افسر ایک دوسرے سے شکایت کر رہے تھے کہ کیا مزار میں ایک لمحے کیلئے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

معظم علی ایک سال بعد چند دن کی رخصت لے کر گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اگلے بیسے فرحت کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے والدین اور مرزا حسین بیگ کی درخواست تھی کہ وہ

شادی کی تاریخ تک واپس نہ جائے۔ چنانچہ اس نے سراج الدولہ کو لکھا کہ مجھے تین ہفتے اور مرشد آباد ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس خط کا جواب آنے سے پہلے اڑیسہ بیسے ایک

نئے انقلاب کی خبر لگئی اور وہ یہ سچی کہ مرہٹوں نے اچانک حملہ کر کے میر صاحب کو جسے علی درجہ

خاں نے مرہٹوں سے مصالحت کی خاطر کنگ کا فوجدار تسلیم کیا تھا، قتل کر دیا ہے اور ان کی

افواج اڑیسہ کے بیشتر اضلاع پر قابض ہو چکی ہیں۔

معظم علی کو اپنے باپ کی زبان یہ معلوم ہوا کہ علی درجہ خاں نے مرشد آباد کی فوج کو کوچ کی

تیاری کا حکم دیا ہے اور ڈھاکہ اور ہنگی کے فوجداروں کو یہ زبان بھیجا ہے کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر اپنی

جہنم میں جوں تک دیا تھا یہ لوگ اپنی محنت و مشقت سے فراغت اور خوشحالی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے میں مصروف تھے اور جب بڑے بڑے صوبوں کے عیش پرست حکمرانوں کی افواج اپنی رعایا کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے بچانے سے قاصر تھیں، یہ لوگ اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کے لیے متحد اور منظم ہو رہے تھے۔

معظم علی زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ ٹھہرنے کی نیت سے آیا تھا، لیکن اس نے تین بیسے یہاں گزار دیئے۔ ابتدا میں کبھی کبھی وہ اطراف اور اکبر کے ساتھ شیر کا شکار کھیلنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ جب شکار سے اس کا جی بھر گیا تو گاؤں کے لوگوں کے ساتھ تیر اندازی، نیزہ بازی اور تیغ زنی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔

تین ماہ بعد جب وہ اطراف اور اکبر خاں کو خدا حافظ کہہ رہا تھا تو اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین دوستوں اور ساتھیوں سے جدا ہو رہا ہے۔ اطراف اکبر اور علاقے کے چند آدمی ادھ کی سرحد تک اسے چھوڑنے کے لیے آئے۔ اکبر خاں کے ساتھ جب وہ

مصابفہ کر رہا تھا تو اس نے اکبریدہ ہو کر کہا: "بھائی جان، آپ پھر کب آئیں گے؟"

مجھے معلوم نہیں، اکبر خاں! ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آجاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج کے بعد ہم اس زندگی میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔

اکبر خاں سے رخصت ہو کر معظم علی نے آگرہ اور دلی کا رخ کیا۔ دلی سے واپسی پر کچھ

موصوفہ کھنڈ اور بالآخر اپنے ساتھ مسلمانوں کی زبوں حالی کی دلخراش داستانیں لیے

گھر پہنچا۔

○

گھر میں معظم علی کو سکون نصیب نہ ہوا کچھ عرصہ وہ بیکاری کے لمحات کتابیں پڑھنے

میں صرف کرتا رہا، لیکن چند ہفتوں کے بعد اس کی طبیعت کتابوں سے بھی اچاٹ ہو گئی۔

ایک دن اس کا بھائی یوسف علی رخصت پر گھر آیا اور ایک ہفتہ رہ کر واپس چلا گیا۔ جب معظم علی

اپنے ساتھ دوسرے کا رکھی لایا ہوں۔“

معظم علی نے دبی زبان میں یوسف سے پوچھا۔ ”بھائی جان یہ کون ہیں؟“

”یہ شوکت بیگ ہیں۔ جن کی افضل کی ہمیشہ کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔“

افضل نے شوکت بیگ کو معظم علی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ معظم علی ہیں،

یوسف علی کے چھوٹے بھائی۔“

شوکت بیگ نے آگے بڑھ کر معظم علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام شوکت

بیگ ہے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں آپ کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔

شوکت بیگ کھلتے ہوئے رنگ کا ایک قوی الجشتہ نوجوان تھا اور چہرے سے اس کی

عمر کوئی پچیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، محمود علی، یوسف، افضل اور مرزا شوکت بیگ ایک خیمے میں

بیٹھے بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ اب تک معظم علی کو صرف اتنا معلوم تھا کہ

شوکت بیگ ڈھاکہ کے ایک بہت بڑے زمیندار کا لڑکا ہے اور میرمدن کی فوج کے

ساتھ اس کی آمد اس کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ لیکن یوسف علی سے استفسار پر اسے

معلوم ہوا کہ وہ اپنی ذاتی فوج کے دو سو سپاہیوں کے ساتھ ایک رضا کار کی حیثیت میں

میرمدن کے ساتھ آیا ہے۔ معظم علی کے نزدیک اس کا یہ جذبہ قابل قدر تھا اور اس نے

شوکت بیگ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مرزا صاحب! آپ بنگال کے امراء کے لیے ایک

بہت اچھی مثال پیش کر رہے ہیں۔ درزاب تو حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں آجماں

خطرات کا احساس تک باقی نہیں رہا۔“

شوکت بیگ نے جواب دیا۔ ”اجتماعی خطرے کا مجھے بھی کچھ زیادہ احساس نہیں تھا۔

میں نے صرف آپ کی تقلید کی ہے۔ جب مرشدآباد پر حملہ ہوا تھا اور میں نے یہ سنا تھا کہ آپ

نے اپنے محلے کے چند رضا کاروں کے ساتھ مرہٹوں کی ایک منظم فوج کے دانت کھٹے کر دیئے

افواج لے کر اڑیسہ کے محاذ پر پہنچ جائیں۔ معظم علی نے کسی توقف کے بغیر ہلکی کارخ کیا۔

دو ہفتوں کے بعد ہلکی اور مرشدآباد کی فوج ٹنگ سے چند منزل دور پڑاؤ ڈال کر ڈھاکہ سے

میرمدن کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ محمود علی اور افضل بیگ مرشدآباد کی فوج کے ساتھ

آئے تھے۔ پانچ دن بعد میرمدن بھی پانچ ہزار سواروں کے ساتھ پہنچ گیا۔ جب میرمدن کی فوج

پڑاؤ میں داخل ہوئی تو فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے میرمدن

نے گھوڑے سے اتر کر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا۔ جب معظم علی کی باری آئی

تو اس نے کہا۔ ”معظم علی! تمہیں دیکھ کر میری ساری تھکاوٹ دور ہو گئی ہے۔ میں سرج لڑنے

سے ملنے کے بعد تمہارے ساتھ اطمینان سے باتیں کروں گا۔“

میرمدن ایک افسر کی رہنمائی میں سراج الدولہ کے خیمے کی طرف بڑھا اور افضل

نے جو چند قدم دور کھڑا تھا معظم علی کو آواز دی۔ ”معظم علی! تمہارے بھائی جان بھی آگئے ہیں۔“

کہاں ہیں وہ؟“ معظم علی نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔

”وہ دیکھو۔“ افضل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یوسف علی کوئی تیس قدم دور لشکر کے چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ معظم علی اور

افضل تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ یوسف علی نے ان کے ساتھ یکے بعد دیگرے

مصافحہ کیا۔ اچانک افضل کو معظم علی کے پیچھے ایک اور نوجوان دکھائی دیا جو اپنے گھوڑے

کی باگ تھامے کھڑا تھا۔

افضل نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ یہاں

کیسے آئے؟“

”میں ڈھاکہ کی فوج کے ساتھ آیا ہوں۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

افضل نے کہا۔ ”مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ فوج میں شامل ہو چکے ہیں۔“

نوجوان نے قدرے آزدہ ہو کر جواب دیا۔ ”اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں

تھے، تو میرے دل میں بھی اپنے مزارعین کو فوجی تربیت دینے کا خیال پیدا ہوا۔ پھر ایک دفعہ جب مرزا حسین بیگ ہمارے یہاں تشریف لائے اور انھوں نے آپ کے شاندار کارنامے کی بے حد تعریف کرنے کے بعد مجھے بھی تبلیغ کی تو میرا خیال پختہ ہو گیا۔ ہمارا گھر ڈھاکے سے پندرہ میل دور ہے۔ مرزا صاحب اپنے خطوط میں بار بار یہ تاکید کیا کرتے تھے کہ ہمارے مکان کے گرد ایک مضبوط فصیل اور ایک گہری خندق کا ہونا ضروری ہے اور میں نے اپنی سمجھ کے مطابق مرزا صاحب کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اس ہم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو چند دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے خاندان کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

رات کے وقت جب معظم علی کو تنہائی میں اپنے بھائی یوسف کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملا تو اس نے پوچھا: "بھائی جان! مجھے تو مرشد آباد میں یہ معلوم ہوا تھا کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہونے والی ہے؟"

یوسف نے جواب دیا: "فرحت کی شادی اس ہم کے اختتام تک کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے۔ مرزا حسین بیگ نے اڑیسہ کے حالات کی اطلاع ملنے ہی شوکت بیگ کے والد کو لکھا تھا کہ افضل فوج کے ساتھ اڑیسہ کی ہم پر جارہا ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ جب تک ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے فرحت کی شادی ملتوی کر دی جائے شوکت بیگ غالباً مرزا صاحب کو خوش کرنے کے لیے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتا ہے۔ اس لیے میرے مدد کے ساتھ آگیا ہے۔"

معظم علی نے سوال کیا: "آپ اس سے کب متعارف ہوئے؟"

"اس نے خود ہی ڈھاکہ میں تلاش کیا تھا۔ ایک دن یہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے مرزا حسین بیگ نے کھلا ہے کہ میں آپ سے ملوں۔ شوکت بیگ اچھا آدمی ہے۔ ایک دن یہ مجھے اپنے گھر بھی لے گیا تھا۔ ان کا خاندان بہت با اثر ہے اور میرے مدد کے ساتھ اس

کے والد کے نہایت دوستانہ تعلقات میں ہوا۔



چند ہفتے بنگال اور مرہٹہ افواج کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوتیں رہیں، پھر مرہٹہ سپہ سالار جانوجی نے ایک شدید حملہ کے بعد بنگال کی فوج کو میدنا پور کی طرف ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ بنگال کی فوج اب میدنا پور کو اپنا مستقر بنا کر اڑیسہ کی شمالی سرحد کے آس پاس مرہٹوں کے اکادمی کا محلے روکنے پر اکتفا کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار ہاں بھی کر رہی تھی۔ پھر چانک ایک دن یہ اطلاع آئی کہ مرہٹوں کے ساتھ بعض افغان سپہ سالاروں کے ساز باز کے باعث بہار کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے علی درودی خاں نے مرہٹہ سپہ سالار جانوجی کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر کے لشکر کو واپس بلایا۔ فوج کا کوئی سپاہی یا فسر اڑیسہ کا صوبہ اس طرح جانوجی کے حوالے کر دینے پر خوش نہ تھا۔ لیکن شوکت بیگ کے لیے یہ خبر انتہائی ناقابل برداشت تھی۔ یہ مدد نے اسے شروع سے چند خفیہ قیدیوں کی ٹھکانی سوئپ رکھی تھی اور اسے انتہائی کوشش کے باوجود کسی مولی لڑائی میں بھی اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ لشکر کی واپسی کی خبر سنتے ہی انتہائی غم و غصہ کی حالت میں میرے مدد کے نیچے میں داخل ہوا اور اس پر برس پڑا: "میرے صاحب میں یہاں مکھیاں مارنے نہیں آیا تھا۔ میرے آدمی گھر جا کر میرا مذاق اڑاتے گئے۔"

میرے مدد سکرایا: "میرے خیال میں تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ کوئی سالار اشد ضرورت کے بغیر نا تجربہ کار رضا کار کو کسی ہم پر نہیں بھیج سکتا اور تمہیں معلوم ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ اکادمی کا محلے میں ہم نے صرف نہایت آزمودہ کار دستے بھیجے تھے۔ اگر باقاعدہ جنگ شروع ہو جاتی تو تمہیں یقیناً اپنے جوہر دکھانے کا موقع دیا جاتا۔"

معظم علی خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

ہاں۔ مجھے تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب بہار کے ہندو

حالات کے پیش نظر اڑیسہ کے متعلق جانوجی کے ساتھ تصفیہ کر چکے ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ مرہٹے کسی معاہدے پر قائم نہیں رہیں گے۔ بہار کے جنوب مغربی علاقوں کو ان کی دست درازی سے محفوظ رکھنے کے لیے سراج الدولہ کی نگاہ انتخاب تم پر پڑی ہے۔ اب اڑیسہ کی بجائے بہار کی جنوب مغربی سرحد کا آخری قلعہ تھاہرا مستقر ہوگا۔ وہاں اس وقت تک اطراف کی کئی بستیوں مرہٹہ لیڈروں کے ہاتھوں تباہ ہو چکی ہیں۔

شوکت بیگ نے کہا: میر صاحب! میں اس مہم میں معظم علی کا ساتھ دوں گا؟
میرمدن نے جواب دیا: نہیں، میں ایک رضا کار کو ایسی خطرناک مہم پر نہیں بھیج سکتا۔

شوکت بیگ نے فیصلہ کن انداز میں کہا: میں آپ کے سامنے علت اٹھاتا ہوں کہ جب تک معظم علی اس مہم سے فارغ ہو کر گھر نہیں جاتا میں اس کے ساتھ رہوں گا۔

معظم علی نے کہا: میں آپ کی ضد کی وجہ نہیں سمجھ سکتا۔ اگر جانوجی کے ساتھ کوئی مصیبت ہو چکی ہے تو اس علاقے میں کسی باقاعدہ جنگ کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ جنگل میں بکھرے ہوئے لیڈروں اور رہزموں سے پنپنے کے لیے ہمیں انتہائی تجربہ کار سپاہیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں آپ کی بہادری کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن اس مقصد کے لیے ہمیں نا تجربہ کار رضا کاروں کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اب گھر جانا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ آپ جنگلوں میں ہمارے ساتھ وقت ضائع کرنے کی بجائے وہاں جنگل کے لیے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔

شوکت بیگ نے تدریجاً برہم ہو کر کہا: میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ میری جان کو اس قدر قیمتی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں دشمن کے ساتھ لڑنے کی نیت سے آیا ہوں! پھر وہ میرمدن کی طرف متوجہ ہوا: "میر خیال ہے کہ ایک رضا کار کی حیثیت میں مرہٹوں سے لڑنے کے لیے مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ معظم علی مجھے اپنا ساتھی بنانے سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن مجھے ی جنگل میں مرہٹوں کا پیچھا کرنے سے نہیں روک سکتے۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ آخر آپ

میری جان ان سپاہیوں سے زیادہ قیمتی کیوں سمجھتے ہیں جو جنگ میں شہید ہو چکے ہیں؟
میرمدن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "اگر تھاہرا یہی فیصلہ ہے تو میں مع نہیں کرتا۔
معظم علی اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

معظم علی نے جواب دیا: "بہت اچھا۔ لیکن میں نے فوجی تربیت آپ سے حاصل کی ہے اور میرے افسر اور سپاہی اکثر شاکی رہتے ہیں کہ میں نظم و ضبط کے معاملے میں بہت سخت ہوں۔ اس لیے جب تک یہ میری کمان میں ہیں انہیں یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ انہیں کسی ترجیحی سلوک کا مستحق سمجھا جائے گا۔"

میرمدن نے شوکت بیگ کی طرف دیکھا اور وہ بولا: "جناب میں جانتا ہوں کہ میں سیر و سیاحت کے لیے نہیں آیا۔"

تھوڑی دیر بعد جب محمود علی، یوسف اور افضل کو شوکت بیگ کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔

اگلے روز علی الصباح دو ہزار سوار معظم علی کی قیادت میں کوچ کے لیے تیار کمرے تھے اور محمود علی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا: "معظم! شوکت بیگ کا خیال دکھنا۔ اگر خدا کا ارادہ اسے اسے کوئی حادثہ پیش آگیا تو ہم مرزا حسین بیگ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"



چند ماہ بعد معظم علی پھر ایک دور افتادہ قلعے میں مقیم تھا، اس عرصہ میں دشمن کے ساتھ اس کی کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ لیکن دور دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں اور پہاڑوں میں سرچھ ایک جگہ سے مارا کر مچا گئے تو دوسری جگہ کسی دوسری بستی پر حملہ کر دیتے۔ معظم علی اپنی فوج کے باقاعدہ سپاہیوں اور افسروں سے کام لینا جانتا تھا، لیکن شوکت بیگ اور اس کے رضا کار ساتھیوں کی رفاقت اس کے لیے ایک مسکن تھی۔ وہ انہیں قلعے کی حفاظت فوج کے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن شوکت بیگ ہر خطرناک مہم میں اس کا ساتھ دینے پر اصرار کیا کرتا تھا۔

معظم علی نے کہا: "اس لڑائی میں تھدی کارگزاری دیکھنے کے بعد اگر مجھے یہ یقین نہ ہوا ہوتا کہ تم ایک اچھے سپاہی بن سکتے ہو تو میں آج ہی تمہیں واپس بھیج دیتا۔"

اس واقعے سے چند ماہ بعد معظم علی کو قلعے کے جنوب میں تیس میل دور مرہٹوں کے ایک لشکر کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اپنی دو تہائی فوج قلعے میں چھوڑ کر باقی سپاہیوں کے ساتھ پیش قدمی کی۔ آٹھ دن بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو سو قیدی تھے۔ فوج کا ایک فہر اسے قلعے کے دروازے پر ملا اور اس نے منوم بچے میں کہا: "جناب مرزا شوکت بیگ زخمی ہیں اور ان کی حالت بہت خراب ہے۔"

معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی: "کہاں ہیں وہ؟ وہ زخمی کیسے ہوئے؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

افسر نے جواب دیا: "وہ اپنے کمرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمارا کہا نہیں ملنا۔ کل میں شمال کی طرف چند بستیوں میں مرہٹوں کے لوٹ مار کی اطلاع ملی تھی۔ تاہم کمانڈر نے اسی وقت دو سو سوار روانہ کر دیئے۔ مرزا شوکت بیگ اس ہم میں حصہ لینے پر مصر تھے۔ ہم نے انہیں کھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔"

تم سب بوقوف ہو۔

معظم علی یہ کہہ کر بھاگتا ہوا قلعے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ شوکت بیگ بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ اس کے سینے، گردن اور بازوؤں پر پٹیاں باندھی ہوئی تھیں۔ فوجی طبیب کے علاوہ چند افسر اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور چند سپاہی کھڑے تھے۔ معظم علی نے کمرے میں داخل ہو کر شوکت بیگ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر طبیب کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا: "زیادہ شدید تو نہیں؟"

طبیب نے جواب دیا: "بہت شدید ہیں۔"

معظم علی نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنے سالاروں کی طرف دیکھا اور کہا: "میں

رک سدا آدی رات کے وقت معظم علی کو قلعے سے بیس میل دور دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اسی وقت پانچ سو سواروں کو تیاری کا حکم دیا۔ شوکت بیگ نے حسب معمول سنا جانے پر اصرار کیا اور اس دفعہ انکار نہ کر سکا۔ اس ہم میں معظم علی کو احساس ہوا کہ یہ سادہ دل فوجی حماقت کی حد تک بہادر ہے۔ اس لڑائی میں شوکت بیگ یہ ثابت کر چکا تھا کہ گولیوں کی بارش میں بھی وہ سینہ تان کر کھڑا ہو سکتا ہے اور پھر جب دشمن کے سپاہی شکست کھا کر جنگل میں جاگ رہے تھے تو وہ معظم علی کے احکام کا انتظار کیے بغیر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ جن سپاہیوں نے اسے جنگلوں اور پہاڑیوں میں گھوڑا دوڑاتے دیکھا تھا وہ شام کے وقت معظم علی سے یہ کہہ رہے تھے: "یہ محض اتفاق ہے کہ یہ فوجان زندہ واپس آگیا ہے۔"

جب شوکت بیگ کئی میل مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آیا تو اس نے معظم علی سے کہا: "میں نے سات آدمی اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیے ہیں لیکن افسوس کہ میرا گھوڑا تھک گیا تھا۔"

معظم علی نے کہا: "دیکھو شوکت! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تم بہادر ہو لیکن تم بلاوجہ اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہو۔ آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو مجھے مجبوراً تمہیں قلعے میں بند رکھنا پڑے گا۔ تمہارے آٹھ آدمی بلاوجہ مارے گئے ہیں۔"

شوکت نے جواب دیا: "لیکن ان آٹھ آدمیوں میں سے ہر ایک کراؤ کم دو مرہٹوں کو ساقط لے کر رہا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر وہ آٹھ آدمی زندہ رہتے تو یقیناً اس سے بہتر نتائج پیدا کر سکتے تھے۔"

شوکت بیگ نے کہا: "یہ میری پہلی لڑائی تھی۔ لیکن آئندہ کے لیے میں محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

شام تک شوکت بیگ پر بہوشی کے دورے پڑتے رہے۔ عشاء کی نماز کے بعد مظل
انتہائی اضطراب اور پریشانی کی حالت میں قلعے کے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ وہ قصور میں کبھی
مرزا حسین بیگ اور کبھی فرحت اور اس کی والدہ کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس سے پوچھ رہے تھے
"تم نے شوکت کو تنہا کیوں چھوڑ دیا؟ تم نے اس کی حفاظت کیوں نہ کی؟ جب ڈھاکہ
کی فوج واپس آرہی تھی تو تم اسے اپنے ساتھ کیوں لے گئے؟ وہ مذمت کے قافیاں
برداشت بوجھ تلے پیچا جا رہا تھا اور اس کی زبان سے بار بار اس قسم کی دعائیں نکل رہی
تھیں: "میرے مولیٰ! اگر تیری بارگاہ میں میری کوئی دعا قبول ہو سکتی ہے تو میں تجھے شہنشاہ
کی زندگی کی بھیجک مانگتا ہوں۔ میرے اللہ میں عہد کرتا ہوں کہ میں مرتے دم تک فرحت کا
خیال اپنے دل میں نہیں لادوں گا۔ تو جانتا ہے کہ میں غلوں دل سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ زندہ رہے
اس میں تمام وہ خوبیاں ہیں جو فرحت کے رفیق حیات میں ہونی چاہئیں، وہ فرحت کو خوش
رکھ سکتا ہے اور فرحت کی خوشی میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔"

طیب شوکت کے کمرے سے باہر نکلا اور اس نے معظم علی کے قریب پہنچ کر کہا: "وہ
اب ہوش میں ہے اور آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا
چاہتا ہے۔"

معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور شوکت بیگ کے بستر کے
قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چراغ کی روشنی میں اسے شوکت بیگ کا چہرہ بے حد نظر آتا
تھا۔ اس نے مغموم لہجے میں کہا: "شوکت اب کیا حال ہے؟"

شوکت نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا: "میرے
دوست آپ کو میرے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کی
حکم برداری کی۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"

شوکت بیگ! مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمہارا زہر دہنا ضرور ہے۔"

نے حکم دیا تھا کہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کی جائے اور اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم میں سے
کس کی عقلیت کا نتیجہ ہے؟"

ایک سالہ نے جواب دیا: "ہم سب نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کسی کی
بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر میں احتیاطاً ڈیڑھ سو سپاہی لے کر ان کے پیچھے گیا تھا۔
رہنے ہمیں دیکھتے ہی ہلکے ہوئے۔ ہم نے کوئی پانچ میل ان کا تعاقب کیا اس کے بعد جنگل
زیادہ گہناں تھا اور میں نے سپاہیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ لیکن یہ مڑھول کا پیچھا چھوڑنے کے لیے
تیار نہ تھے۔ میں مجبوراً ان کے پیچھے چلتا گیا اور چنچ چنچ کر انہیں روکنے کی کوشش
کی لیکن انہوں نے میری طرف توجہ نہ دی۔ اچانک گھنے جنگل میں ایک ٹیلے کے پیچھے سے
گولوں کی بوچھاڑ آئی اور ان کی آن میں ہمارے پچیس آدمی گر پڑے، اس کے بعد مرہٹے مقابلہ
کرنے کی بجائے جنگل میں غائب ہو گئے۔ یہ بری طرح زخمی تھے۔ آپ ان کے آدمیوں سے پوچھ
سکتے ہیں، اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ کاش آپ کی طرف سے ہمیں یہ اجازت ہوتی کہ اگر یہ
زبردستی قلعے سے باہر نکلے کی کوشش کریں تو انہیں کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے!"

معظم علی مذہال سا جو کہ شوکت بیگ کے بستر کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا: "تم
نے بہت برا کیا۔ اب میں مرشد آباد واپس جا کر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

شوکت بیگ نے آنکھیں کھولیں اور کراہتے ہوئے کہا: "آپ کے ساتھی بے قصور ہیں۔ انہوں
نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اپنی ذمہ داری پر دشمن کا پیچھا کیا تھا۔"

معظم علی نے پرامید ہو کر طیب کی طرف دیکھا اور ملتی لہجے میں کہا: "آپ ان کی جان بچانے
کی ہر ممکن کوشش کریں۔"

طیب نے جواب دیا: "آپ اطمینان رکھتے میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔"

شوکت بیگ نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

ایک دن میرے ابا جان نے مرزا حسین بیگ کے سامنے میری تعریف کی تو انہوں نے کہا۔
بنگلہ میں صرف ایک فوجان پیدا ہوا تھا اور اس کا نام معظم علی تھا۔ پھر ہماری جنگی ہوگی اور
اس کے چند ہی ہفتے بعد تم واپس آ گئے۔

میری شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ لیکن جب ڈھاکہ کی فوج اڑیسہ کی طرف کوچ کی
تیار کر دی تھی تو میرے ابا جان کو حسین بیگ کا خط ملا جس میں انہوں نے یہ لکھا تھا کہ
افضل معاذ پر جا رہا ہے۔ مرہٹے ہماری قوم کے ہر فوجان کو اڑیسہ کے میدانوں میں فکا رہے ہیں
اس لیے میری خواہش ہے کہ جنگ کے اختتام اور افضل بیگ کی واپسی تک شادی ملتوی
کر دی جائے۔ انہوں نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ میرے جن دوستوں کا شادی کے موقع
پر ہونا ضروری ہے وہ سب معاذ پر جا چکے ہیں۔ میں اسی وقت سیدھا میرمن کے پاس پہنچاؤ
انہیں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اب تم سمجھ گئے ہو کہ میرے یہاں آنے کی وجہ کیا تھی۔ میں
مرزا حسین بیگ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں بنگال کے کسی فوجان سے کم نہیں ہوں۔ میری
یہ خواہش تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر میں کسی اور کی بجائے صرف میرے بہادر زادہ کارناموں کا
ذکر ہو۔ میں ہر میدان میں تم سے چند قدم آگے رہنا چاہتا تھا۔ لیکن میں کوئی قابل ذکر کارنامہ
میراجنام زد سے سکا۔ میں کوشش کے باوجود ان لوگوں کی صف میں کھڑا نہ ہو سکا۔ جنہیں
لڑائی کے بعد داد و تحسین کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ تم ہر میدان میں مجھ سے آگے تھے اور میں یہ
محسوس کرتا تھا کہ میری حیثیت ایک تاشانی سے زیادہ نہیں۔ اس وقت اگر مجھے کسی بات کا
انوس ہے تو وہ یہ ہے کہ میں اپنے ایک بہترین دوست اور ساتھی کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔
مرزا حسین بیگ درست کہتے تھے کہ بنگال نے صرف ایک فوجان پیدا کیا اور وہ معظم علی ہے۔
معظم علی نے کہا۔ "بنگلہ کے ہزاروں فوجان مجھ سے بہتر ہیں اور تم ان میں سے ایک ہو۔"
شوکت بیگ نے کہا۔ "معظم علی مجھے یقین ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو ہم ایک دوسرے
کے لیے بہترین دوست ثابت ہوں گے لیکن میری منزل اب قریب آ چکی ہے۔ اس وقت

شوکت نے کہا۔ "آپ مجھے ہمیشہ خطرے کے سامنے جانے سے روکنے کی کوشش
کیا کرتے تھے، مجھے اس بات سے چڑھ چکی تھی۔ میں بچپن سے بے حد ضدی ہوں۔ میں ہمیشہ
یہ محسوس کیا کرتا تھا کہ آپ شاید مجھے بزدل سمجھتے ہیں۔"

نہیں شوکت! مجھے صرف اس بات کا ڈر تھا کہ تمہاری جرأت میرے لیے کسی پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔
شوکت نے کہا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ ہائی آدمیوں کے مقابلے میں
بہتر جان اس قدر قیمتی کیوں سمجھتے ہیں؟

معظم علی نے جواب دیا۔ "اگر تم باقاعدہ فوج کے سپاہی ہوتے تو تمہیں یہ کہنے کی ضرورت
پیش نہ آتی۔ لیکن تم ایک رضا کار کی حیثیت میں آئے تھے اور میں چاہتا تھا کہ صحیح سلامت
اپنے گھر واپس جاؤ۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے اور ایک ایسے خاندان
کی تنگی سے جو مجھے بے دروز پر ہے۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تم تندرست
ہو کر اپنے گھر پہنچ جاؤ اور مجھے مرزا حسین بیگ کے سامنے شرمسار نہ کرے۔"

شوکت بیگ نے کہا۔ "میں شاید گھر واپس نہ جا سکوں۔ لیکن آپ جب مرزا حسین بیگ
سے ملیں تو ان سے یہ ضرور کہیں کہ میری موت ایک سپاہی کی موت تھی۔ میں اس بات کا اثر
کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے سپاہی بننے کا شوق کبھی نہ تھا اور یہ شوق صرف تمہاری وجہ سے پیدا
ہوا۔ میں بچپن میں ہی اپنے والدین سے سنا کرتا تھا کہ میری جنگی مرشد بابا کے ایک معزز خاندان
کی لڑکی کے ساتھ ہوگی۔ اس کے بعد بڑا ہو کر میں نے یہ سنا کہ ایک عزیز خاندان
کے لڑکے نے اپنی جان پکھیل کر مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت کی ہے اور شاید وہ اس
کے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ پھر تمہاری قید کے زمانے میں
مرزا صاحب ہمارے ہاں آئے تو وہ بات بات پر تمہارا تذکرہ کرتے تھے اور مجھے بار بار یہ
احساس دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ اس زمانے میں ہر فوجان کے لیے سپاہی بننا ضروری
ہے اور میں تمہیں دیکھنے بغیر تمہارے متعلق اپنے دل میں ایک رقابت کا جذبہ محسوس کرتا تھا۔"

دل ہے۔ لیکن کاش اس سے پہلے میں تھیں یہ بتا سکتا کہ میں جس فرحت کو جانتا ہوں، وہ ان لڑکیوں سے مختلف ہے جو اپنے رشتہ جیات کا دوسرے انسانوں سے موازنہ کرتی ہیں۔

شوکت بیگ نے کہا تم اسے جانتے ہو اور تم اس سے محبت کرتے ہو؟
معظم علی کا سارا جسم کپکپا اٹھا اور اس نے کہا: شوکت خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ تمہارے لیے ہے اور میں اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں تندرست ہوتے ہی گھر بھیج دوں گا۔

شوکت بیگ نے کہا: میرے دوست ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ میں نے یہ باتیں تمہارا دل دکھانے کے لیے نہیں کیں، صرف اس لیے کہ میں کہ میرے دل پر یہ ایک وجہ تھا کہ میں ایک ایسے آدمی کے خلاف اپنے دل میں نفرت اور رقابت کے جذبات رکھتا تھا جس کے ساتھ مجھے محبت کرنی چاہیے تھی۔ معظم علی! تم انسان نہیں ایک فرشتہ ہو۔ کاش اس وقت افضل کی بہن یہاں موجود ہوتی اور اسے میں یہ کہہ سکتا کہ میں تمہارا مستقبل ایک بہتر انسان کو سونپ کر جا رہا ہوں۔ شوکت بیگ نے یہ کہہ کر معظم علی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ معظم علی کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے اور شوکت بیگ کے ہاتھوں پر ایک سکرا بٹ کھیل رہی تھی۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ پر شوکت بیگ کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیل ہو رہی تھی۔ اس کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ معظم علی نے طبیب کو آواز دی طبیب نے اگر شوکت بیگ کی جنس دیکھی اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ان کا وقت آچکا ہے۔ اس کے بعد وہ دیر تک جانچنے کی حالت میں پڑا اور رات کے پچھلے پہر جب قلعے سے باہر کسی درخت پر گول کی آواز صبح کی آمد کا پیغام دے رہی تھی۔ شوکت بیگ اپنا سفر حیات ختم کر چکا تھا۔

اگر مرزا حسین بیگ یہاں موجود ہوتے تو میں ان سے یہ کہتا کہ میں نے معظم علی بننے کی کوشش کی تھی اور میری حماقت تھی۔

انسان اپنی زندگی میں عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔ ایک دن وہ تھا جب تمہارا نام میرے نزدیک ایک گالی تھا۔ معظم علی برا نہ مانا۔ اب مجھے یہ باتیں کہتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات سے چڑھتی کہ تم مرزا حسین بیگ کے ٹروس میں رہتے ہو اور محلک ہر آدمی تمہاری تعریفیں کرتا ہے۔ میں نے آج تک فرحت کو نہیں دیکھا لیکن جو کچھ اس کے متعلق میں نے اپنی ماں اور بہنوں سے سنا تھا وہ میرے دل میں یہ احساس پیدا کرنے کے لیے کافی تھا کہ ایسی جگہ کا شریک حیات بننا زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ مجھے یہ بات گوارا نہ تھی، کہ وہ کسی ایسے آدمی کو جاتی ہو جو مجھ سے بہتر اوصاف کا مالک ہو۔ فرحت کے رشتے سے مرزا حسین بیگ کا انکار میری زندگی کی سب سے بڑی شکست تھی اور میرے لیے اس شکست کا سب سے زیادہ ناقابل برداشت پہلو یہ تھا کہ میرے مقابلے میں ایک غریب ملازمان کے لڑکے کو ترجیح دی گئی ہے۔ اپنے والدین کی باتوں سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ فرحت کے والدین تمہاری طرف مائل ہیں۔ پھر جب تم لاپتہ ہو گئے تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میرے راستے سے ایک پہاڑ مٹ گیا ہے۔ لیکن فرحت کے ساتھ منگنی ہو جانے کے بعد بھی میری خوش آرزو تھی۔ مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ میں اس کے لیے معظم علی نہیں بن سکا گا۔ پھر ہماری شادی کی تاریخ طوی کرنے کے متعلق مرزا صاحب نے جو خط لکھا اسے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے بے بسی، بزدلی اور بے غیرتی کا طعنے دیا جا رہا ہے۔ جب میں گھر سے روانہ ہوا تھا تو میرے عوام یہ کہتے تھے کہ میں کسی دن فتوحات کے پرچم لہراتا ہوا واپس آؤں گا۔ اور فرحت، محبت اور ناموری کے سینکڑوں تاج فرحت کے قدموں پر ڈھیر کر دوں گا۔ تم میری محبتوں پر منہ ہو گے۔

معظم علی نے کہا: نہیں شوکت! میں جانتا تھا کہ میرے سینے میں ایک بنیاد تھی۔

ماں سے کہا: "امی جان! میری رخصت منسوخ کر دی گئی ہے اور میں کل صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

ماں نے مغموم لہجے میں کہا: "میرا خیال تھا کہ سراج الدولہ اور میرمدن تمہیں مرشد آباد میں کوئی عہدہ دے دیں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "امی جان! میرا دل جانا ضروری ہے۔ میں نے میرمدن سے درخواست کی تھی کہ وہ بھائی یوسف کو ڈھاکہ سے یہاں بلا لیں اور انھوں نے میری یہ بات مان لی ہے۔"

ماں نے کہا: "بیٹا! میں ایک عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر جا کر تھامے رشتے کے متعلق کچھ کہوں۔ ابھی فرحت کی ماں مجھ سے مل کر گئی ہے اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ جج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے مرزا صاحب فرحت کے رشتے کے متعلق بہاؤ طرف سے سلسلہ جنمبانی کے منتظر تھے۔ میں نے کہا: بہن میں تو ہر روز معظم کے ابا کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا کرتی تھی، لیکن انھیں حوصلہ نہیں ہوا۔ اب اگر آپ تیار ہیں تو میں ابھی محلے میں مٹھائی تقسیم کرواتی ہوں۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ ہمیں جج سے مرزا صاحب کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

معظم علی نے جھپکے اور شرماتے ہوئے کہا: "امی جان فرحت کیسی ہے؟"
ماں نے جواب دیا: "فرحت چند ہفتوں سے کچھ بیمار تھی۔ لیکن اب بالکل ٹھیک ہے۔"
چند دن بعد معظم علی سرمدی قلعے میں پہنچ چکا تھا۔

علی دردی خاں کے آنکھیں بند کرتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا۔ انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قلعوں اور اسلحہ خانوں میں تبدیل ہونے لگیں اور وہ حریفوں سمیت آزما جو قوم کی عزت اور آزادی کو مال تجارت سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے

طوع آفتاب کے تھوڑی دیر بعد شوکت بیگ کو سپرد خاں کیا جا چکا تھا اور اس کے ساتھی واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ معظم علی نے شوکت بیگ کے والد اور مرزا حسین بیگ کے نام خطوط لکھ کر ان کے حوالے کر دیئے۔

اگلے دن معظم علی، علی الصباح ایک ہزار سوار لے کر مرہٹوں کے تعاقب میں روانہ ہوا اور چند ہفتے سرحد کے جنگلوں اور پہاڑوں میں الٹا پیچھا کرتا رہا۔ جب وہ اس ہم سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اس کے ساتھ چار سو قیدی تھے۔ اس کے بعد قریباً ڈیڑھ سال وہ سرحد کے اہم مقامات پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے اور مرہٹوں کے ستائے ہوئے لوگوں کی دیرانہستہوں کو دوبارہ آباد کرنے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے میرمدن کے نام درخواست لکھ کر ایک ماہ کی رخصت لی اور مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔

مرشد آباد پہنچتے ہی اسے معلوم ہوا کہ علی دردی خاں بستر مرگ پر ہے اور سراج الدولہ نے میرمدن اور سلطنت کے چند اہل بڑے عہدیدوں کو مرشد آباد بلا لیا ہے۔ مرزا حسین بیگ کے متعلق اسے یہ اطلاع ملی کہ وہ چند ہفتے قبل ایک جہاز پر حج اور مقامات مقدسہ کی زیارت کی نیت سے روانہ ہو چکے ہیں۔

معظم علی نے گھر میں اپنی چھٹی کے پانچ دن گزارے تھے کہ علی دردی خاں واپس آئے ہوا اور مرشد آباد کے باشندے یہ محسوس کر رہے تھے کہ بنگال کا وہ دفاعی حصار ٹوٹ چکا ہے جسے وہ اپنی آزادی اور بھائی سب سے بڑی ضمانت سمجھتے تھے۔ مرشد آباد کی مساجد میں علی دردی خاں کے لیے مغفرت اور بنگال کے نئے حکمران سراج الدولہ کے لیے کامیابی اور کامرانی کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

علی دردی خاں کی وفات کے تین دن بعد معظم علی نے میرمدن سے جسے ڈھاکہ سے بلا کر بنگال کی فوج کی سپہ سالاری سپرد کی گئی تھی، ملاقات کی اور اس کے بعد گھر واپس آکر اپنی

ساتھ ساز باز کرنے لگے۔ سراج الدولہ کو انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی اور اس نے مندرجہ حکومت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے الیٹ اٹریا کیبنی کی طرف توجہ کی۔ انگریز تاجر حکومت بنگال کے ساتھ اپنے سابقہ معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر قطع بندوبست میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ مصالحت کی گفتگو بے نتیجہ ثابت ہو چکی تھی اور سراج الدولہ کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ بنگال کی حکومت کے نئے دعویداروں کو صرف ایک فوجی شکست ہی راہ راست پر لاسکتی ہے۔ چنانچہ ایک دن فورٹ ولیم کے سفید فام محافظ شیر بنگال کی گرج سن رہے تھے۔

معظم علی چند ماہ سے مغربی سرحد پر اپنا مورچہ سنبھالے ہوئے تھا۔ اسے انگریزوں کے متعلق سراج الدولہ کے عزائم کا علم ہوا تو اس نے میرمدن کو ایک خط لکھا کہ اب سرحدی علاقوں کو کوئی خطرہ نہیں، اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔

چند ہفتوں تک اس کی درخواست کا کوئی جواب نہ آیا اور وہ سخت بے چین رہا۔ پھر ایک دن اسے میدانِ چھگڑ کے فوجدار کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ نواب سراج الدولہ نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کے چار دن بعد اسے میرمدن کا خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ہم انگریزوں کو ایک عبرتناک شکست دے چکے ہیں۔ لیکن تمہیں یہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری اس کامیابی میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ انگریزوں کے خلاف ہم نے ایک لڑائی جیتی ہے لیکن بنگال کو ان کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لیے ہمیں شاید ایسی کئی اور جنگیں لڑنی پڑیں اور ان جنگوں سے ہم اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ ہمارے سرحدی علاقے مرہٹوں کے حملوں سے محفوظ ہوں۔ تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے اور تم نے ہر مرحلے پر اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کیا ہے اس لیے میری یہ خواہش ہے کہ جب تک انگریزوں سے ہماری جنگ ختم نہیں ہوتی تم بنگال کے

مغربی دروازے پر پہرہ دیتے رہو اور میں تم جیسے مجید اور فوجان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ لڑنے والے سپاہی کی نسبت خاموشی سے پہرہ دینے والے سپاہی کا کام بسا اوقات زیادہ صبر آدما ہوتا ہے۔

چند ہفتے اور گزر گئے اور معظم علی کو اس کے سوا کچھ معلوم نہ تھا کہ سراج الدولہ انگریزوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک دن اسے اپنے والد کا خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مرزا حسین بیگ حج سے واپس آگئے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ تم چند دن کے لیے گھر آؤ۔ اس نے میدانِ پور کے فوجدار کو ایک ماہ کی رخصت کے لیے درخواست بھیجی، لیکن اس نے جواب میں لکھا کہ "موجودہ حالات میں تمہیں ایک دن کیلئے بھی چھٹی دینا ممکن نہیں۔ نواب سراج الدولہ نے مجھ سے پانچ ہزار سوار دو ہفتوں کے اندر اندر مرشد آباد بھیجنے کا مطالبہ کیا ہے انھوں نے اس کی وجہ بیان نہیں کی تاہم یہ سالار کے خط سے میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ عنقریب انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ مدت اور انتظار کرو۔ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں تمہیں ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کی چھٹی دے دوں گا۔ فی الحال پانچ ہزار سواروں کی تعداد پوری کرنے کیلئے تمہارے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے میرا خط ملتے ہی اپنے تمام فالتو سپاہی سیدھے مرشد آباد روانہ کرو اور اپنے پاس صرف اتنے آدمی رکھو جو قلعے اور سرحدی چوکیوں کی حفاظت کے لیے اشد ضروری ہوں۔"

معظم علی نے یہ خط ملتے ہی پانچ سو سپاہی قلعے کی حفاظت اور تین سو اس پاس کی چھوٹی چھٹی چوکیوں کی نگرانی کے لیے روک لیے اور باقی فوج کو اپنے ایک تجربہ کار انسٹر کی کمان میں دے کر مرشد آباد کی طرف کوچ کا حکم دیا۔

چند ہفتے معظم علی کو مرشد آباد کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی اور وہ سخت بے چین رہا۔

میں حملہ کر کے ہمارے مشیر آدمی قتل کر دیئے۔ میرے باقی ساتھی ادھر ادھر بھاگ گئے تھے مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

معظم علی نے ایک عمر رسیدہ افسر کی طرف متوجہ ہو کر کہا: عبدالرحمن! معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں نے بڑے پیلے پر پیشقدمی شروع کر دی ہے۔ مجھے شاید اس مہم میں چند دن لگ جائیں۔ میری غیر حاضری میں قلعے کی حفاظت تمہارے ذمہ ہوگی۔ تم اسی وقت تمام چوکیوں کے سپاہیوں کو یہ حکم بھیج دو کہ وہ قلعے میں جمع ہو جائیں۔ اگر مرہٹوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔ ہمیں باہر سے کسی فوری کمک کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ اگر مرہٹے آگے بڑھ آتے تو یہ قلعہ ہمارا آخری سہارا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی تین سو سواروں سے ہمراہ قلعے سے باہر نکل گیا۔

سرحدی علاقوں پر حملہ کرنے والے مرہٹوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ رہتی، وہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے سرحدی علاقے کی حفاظت فوج کی دفاعی طاقت کا اندازہ کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ علی الصباح قلعے سے چند میل دور مرہٹوں کے چند دستوں کے ساتھ معظم علی کے سپاہیوں کی جھڑپ ہوئی اور وہ مولیٰ مقابلہ کے بعد پندرہ بیس لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس کے بعد سے چند میل دور مرہٹوں کے ایک اور دستے کی اطلاع ملی اور اس نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

مرہٹوں کے اچانک حملے سے خوفزدہ ہو کر سرحد کے لوگ اپنی بسیتاں خالی کر رہے تھے لیکن معظم علی کی طرف سے بردت جوابی کارروائی کے باعث ان کے حوصلے بندھ گئے اور وہ دوبارہ اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

ایک شام کوئی پچاس مرہٹے ایک بستی کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ معظم علی خبر ملتے ہی وہاں پہنچا اور اس نے تیس آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے پیچھے سے پیشتر مرہٹے بستی کے چودھری کے پانچ بیٹوں کے علاوہ دس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے جن کا

ایک دن اسے محمود علی کا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ: مجھے سراج الدولہ نے اپنے محافظ دستوں کا سالار اعلیٰ مقرر کر دیا ہے۔ یوسف اور افضل بھی محافظ فوج کے سالار بنا دیئے گئے ہیں۔ ہمیں آٹھ پہر کے اندر اندر میاں سے کوچ کا حکم ملا ہے اور انشاء اللہ شہر قریب تم پر سونگے کرہم بنگال کو الیسٹ انڈیا کمپنی سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا چکے ہیں۔ اس کے بعد چند دن اور گزر گئے اور معظم علی کو جنگ کے حالات کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی۔

ایک روز رات کے تیسرے پہر معظم علی قلعے کے اندر اپنی قیام گاہ کی چھت پر گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک پہر ملا نے اسے جگایا اور یہ اطلاع دی کہ مرہٹوں نے سرحد کی ایک چوکی پر اچانک حملہ کر کے تیس سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیئے ہیں۔ معظم علی جلدی سے نیچے اترے۔ چند سپاہی جو سرحد کی چوکی سے بھاگ کر آئے تھے قلعے کے صحن میں کھڑے تھے۔ معظم علی ان سے حملے کی تفصیلات پوچھ رہا تھا کہ دروازے کی طرف سے ایک پہر ملا بھاگا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ دروازے کے باہر ایک آدمی کھڑا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہماری چوکی پر بھی مرہٹوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

معظم علی نے تین سو سواروں کو فوراً تیار ہونے کا حکم دیا اور پھر پہر ملا کی طرف متوجہ ہو کر کہا: اگر تم اسے پہچانتے ہو تو اسے اندر آنے دو۔

”جی میں اسے پہچانتا ہوں۔“ پہر ملا یہ کہہ کر اسی طرح بھاگا ہوا واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک آدمی لنگرانا ہوا قلعے کے صحن میں داخل ہوا۔

معظم علی نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا: ”تم زخمی ہو؟“

”جی میں قلعے سے ایک میل دور گھوڑے سے گر پڑا تھا۔“

”تم کس چوکی سے آئے ہو؟“ معظم علی نے سوال کیا۔

”جی میں شمال کی تیسری چوکی سے آیا ہوں۔ مرہٹوں نے ہم پر بے خبری کی حالت

جرم صرف یہ تھا کہ وہ مرہٹوں کے ہاتھوں چند لڑکیوں کی بے رحمی خاموشی سے برداشت نہ کر سکے۔

معظم علی نے رات بھر اس بستی میں قیام کیا۔ صبح ہوئی تو اس نے اس پاس کی بستیوں کے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: "چوروں اور ڈاکوؤں کے سامنے بیڑوں کی طرح بھاگنے والوں کو بچانا کسی فوج کا کام نہیں۔ فوج کی مدد صرف ان لوگوں کے لیے سودمند ہو سکتی ہے جو بہادروں کی طرح جینا اور مرنا جانتے ہیں۔ اس لیے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم ان چوروں اور ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے اپنی بستیوں میں رضا کاروں کی فوج تیار کرو۔ پھر وہ قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ تم جیسے خونخوار درندوں کے ساتھ جنم قیدیوں کا سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ میں تمہیں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہوں۔ جن کے جوان بیٹوں اور بھائیوں کی ردھیں انتقام کے لیے پکار رہی ہیں اور میں ان سے یہ کہوں گا کہ وہ تمہیں کسی انسانی سلوک ناستی نہ سمجھیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے دوسرے ساتھی اس طرف آئیں تو انہیں اس بستی کے باہر درخت کے ساتھ تمہاری لاشیں ملکتی نظر آئیں۔"

ایک گھنٹہ بعد جب معظم علی اس بستی سے رخصت ہوا تو مقامی لوگ گاؤں سے باہر تیس مرہٹوں کے گلوں میں پھندے ڈال کر درختوں سے لٹکا چکے تھے۔ چند دن تک مختلف مقامات پر درختوں سے لٹکی ہوئی لاشیں اس بات کا ثبوت دیتی رہیں کہ سرحد کا محافظان علاقوں سے گزر رہے۔

قریباً بیس دن کے اندر سرحدی علاقوں میں مکمل امن قائم کرنے کے بعد معظم علی واپس پیناوا اس نے قلعے میں داخل ہوئے ہی اپنے قائم مقام سے سوال کیا۔ "مرشد آباد یا میدناپور سے کوئی اطلاع آئی ہے؟"

جی نہیں! قائم مقام نے جواب دیا:

دو دن بعد میدناپور سے ایک فوجی افسر جس کا نام ہاشم خاں تھا، تیس سواروں کے ہمراہ معظم علی کے پاس پیناوا اور اس نے میدناپور کے فوجدار کا خط پیش کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا "تم خط ملتے ہی قلعے کی کمان ہاشم خاں کے حوالہ کر کے میدناپور پہنچ جاؤ۔ میں چند اہم معاملات کے متعلق تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں!"

معظم علی نے خط پڑھنے کے بعد ہاشم خاں سے سوال کیا۔ "مرشد آباد سے جنگ کے متعلق کوئی اطلاع ملی ہے؟"

ہاشم خاں نے جواب دیا: "جنگ کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں، لیکن مرشد آباد سے ایک خاص اہمچی میدناپور کے فوجدار کے پاس آیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے لیکن اس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد فوجدار نے مجھے اس طرف روانہ کر دیا اور میں یہ معلوم نہ کر سکا کہ اہمچی کیا خبر لایا تھا۔ فوجدار نے اس بات کی سخت تاکید کی تھی کہ آپ فوراً میدناپور پہنچ جائیں!"

معظم علی نے کہا: "اگر وہ تاکید نہ کرتے تو بھی میری طرف سے تاخیر نہ ہوتی۔ میں دہاں پہنچ کر مرشد آباد کے حالات معلوم کرنے کے لیے سخت بے چین ہوں۔"

قریباً آدھ گھنٹہ بعد معظم علی اپنے افسروں اور سپاہیوں کو خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ چار نو جوان اس کے ساتھ تھے۔ وہ قلعے سے صرف چار کوس دور گیا تھا کہ اسے ایک سرسبز سوار اپنی طرف آنا دکھائی دیا۔ جب ان کے درمیان کوئی دوسو گز کا فاصلہ رہ گیا تو معظم علی کے ایک ساتھی نے کہا: "جناب وہ عبداللہ خاں معلوم ہوتا ہے۔"

معظم علی نے تھوڑی دیر آگے جا کر گھوڑا روکا اور آگے والے سوار کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ عبداللہ خاں نے قریب آکر کسی تمہید کے بغیر سوال کیا: "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں میدناپور جا رہا ہوں۔" معظم علی نے جواب دیا: "تم گھر کے حالات سناؤ؟"

عبداللہ خاں معظم علی کی فوج کے سپاس سواروں کا سالار تھا۔ مرشد آباد میں اس کا

گئے ہیں۔ میر جعفر انگریزوں سے بنگال کی آزادی کا سودا کر چکا ہے۔ میر مدن شہید ہو چکے ہیں۔ میر جعفر نے دُج کے انفراد کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ جس وقت ہماری فتح بالکل قریب تھی وہ انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ میں جنگ میں شریک تھا اور غازی اور وطن فدائی کا منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہمارا تو سنا ز خاموش تھا۔ ہمارے بیشتر سوار میدان سے دور کھڑے تھے۔ سراج الدولہ کے مشی بھر جاں نثار سینوں پر گولیاں کھا کھا کر گرے تھے اور ہم آخری وقت تک یہ سمجھتے تھے کہ ہماری توہیں اپنا تک آگ برساہیں گی۔ ہمارے سوار اپنا تک فیصلہ کن حملہ کریں گے اور ان کی آن میں دشمن کو کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ ہم پلاسی کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے جنگ ہار چکے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یوسف اور افضل کو گڑ گڑاتے دیکھا تھا اور آپ کے ابا جان جب انھوں سے چور ہو کر مرشد آباد پہنچے تھے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ سراج الدولہ انھیں مل میں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پھر رات کے وقت جب وہ مرشد آباد چھوڑ رہے تھے تو آپ کے ابا جان کو گھر پہنچا دیا گیا تھا۔ اُسی رات کے وقت انھوں نے دم توڑ دیا تو محلے کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کو اطلاع دوں۔

معظم علی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا: اب ہمیں میدان پور جانے کی ضرورت نہیں۔ تم واپس قلعے میں چلے جاؤ۔ میری منزل مرشد آباد ہے۔ عبداللہ تھا و کیا ارادہ ہے؟

میں آپ کے ساتھ ہوں! اس نے جواب دیا۔

مرشد آباد کی طرف چند منازل طے کرنے کے بعد معظم علی نے یہ خبر سنی کہ سراج الدولہ قتل ہو چکا ہے۔ میر جعفر نے لارڈ کلاؤ کی سرپرستی میں بنگال کی حکومت سنبھال لی ہے اور مرشد آباد میں سراج الدولہ کے وفادار ساتھیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔

مگر بھی معظم علی کے پردوس میں تھا۔ قریباً تین ماہ سے وہ رخصت پر تھا۔ وہ جواب دینے کی بجائے گھوڑے سے اتر پڑا اور گردن جھکا کر معظم علی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کیا بات ہے عبداللہ؟ معظم علی نے سوال کیا۔

عبداللہ خاں نے گردن ادا پڑھائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھک رہے تھے۔ کیا ہوا عبداللہ؟ معظم علی نے مضطرب ہو کر دوبارہ سوال کیا۔ عبداللہ خاں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: میں بہت بری خبر لایا ہوں آپ میدان پور کی بجائے میدے گھر جائیں۔ مرشد آباد لٹ چکا ہے!

معظم علی گھوڑے سے کود پڑا اور عبداللہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چلتا۔ خدا کے لیے مجھے جلدی بتاؤ کیا ہوا ہے؟

عبداللہ خاں نے بڑی مشکل سے اپنی جینیں ضبط کرتے ہوئے کہا: آپ کے ابا جان اور یوسف شہید ہو چکے ہیں۔ افضل بھی شہید ہو چکا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو تمام واقعات کی اطلاع مل چلی ہوگی۔ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔ میر جعفر نے بنگال کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ اپنے باپ، اپنے بھائی اور افضل کی موت کا یقین کر سکتا تھا۔ لیکن بنگال کی افواج کی شکست اس کے لیے ناقابل یقین تھی۔ اس نے کرب انگیز آواز میں سوال کیا: سراج الدولہ کہاں ہیں؟ میں شکست کیسے ہوئی؟ سراج الدولہ کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شکست کے بعد مرشد آباد آگئے تھے اور پھر راتوں رات وہاں سے نکل گئے تھے۔

یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں انگریزوں کے ہاتھوں سراج الدولہ کی شکست پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔

ہمیں انگریزوں نے شکست نہیں دی۔ ہم اپنے غداروں کے ہاتھوں مارے

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library